راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال
ماہنامہ
ارژنگ
لاہور
Monthly
Arzang
Lahore
جولائی ۲۰۲۵ء
مدیرِ اعلیٰ:
عامر بن علی
مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

سیاست کے بغیر شاعری کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے، اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے

نجم فیلوزان لکھنے والوں کو بھی پلیٹ فارم مہیا کر رہی ہے جن کو کوئی اور پلیٹ فارم میسر نہیں ہے

نامور شاعر، ادیب اور ادب کے خدمت گار

جی اے نجم

سے مدیر اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری پیدا نہیں ہو رہی بلکہ یہ تو کتاب تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتا ہے

س: بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج: میرا آبائی شہر اقبال نگر ہے۔ جو کہ ضلع ساہیوال کا شہر ہے اور میاں چنوں شہر کے بالکل قریب ہے۔ میں نے میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول اقبال نگر سے حاصل کی اور پھر ایف ایس سی گورنمنٹ کالج ساہیوال سے کی۔ پھر بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ میں نے 2005 میں جاب شروع کی اور اس کے ساتھ ساتھ ACCA بھی جاری رہا اور 2012 میں ACCA مکمل ہو گیا۔ مجھے باہر کے اندر 20 سال ہو گئے ہیں۔ اگر گردوپیش کے حالات کی بات کی جائے تو میرے بڑے بھائی کو شاعری کا شوق تھا۔ محمد الیاس قیصران کا نام ہے۔ وہ مختلف سنگرز کی غزلیں بڑے شوق سے سنتے تھے، ان کو سن سن کے میرے اندر بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ چونکہ بھائی بھی شاعری کرتے تھے اس لئے ان کو دیکھ دیکھ کے میرا رجحان بھی شاعری کی طرف ہو گیا۔ اور اس طرح میں نے شعر کہنا شروع کیے۔ میرے والد صاحب کا کپڑے کا کاروبار ہے اور اس سلسلے میں وہ باہر بھی جاتے ہیں۔ وہ سائیکل پر کپڑا بیچتے ہیں۔ محنت مزدوری کر کے انہوں نے ہماری پرورش کی اور ہمیں تعلیم دلوائی اور ہمیں اس مقام پر پہنچایا۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے والدین کی محنت اور دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔

س: ادب سے شوق کی ابتداء کیسے ہوئی؟

ج: جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ میرے بڑے بھائی شاعری کا شوق رکھتے تھے اور مختلف سنگرز کی غزلیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ انوپ جلوٹا، مسعود خان، جلو خان کی غزلیں وہ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ تو وہیں سے بس ادب کے سے شوق کی ابتداء ہوئی۔

س: پہلا شعر کب کہا؟

ج: میں نے تقریباً 2002 میں پہلا شعر کہا۔ 2002 سے 2005 تک میں نے جو شاعری کی اس میں کچھ مسائل تھے۔ جس کو کہہ لیں کہ غزل کے مسائل۔ جب 2005 میں جاب شروع ہوئی تو سلسلۂ روزگار میں مصروف ہو گئے۔ ادب کا شوق ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا لیکن وہ چیزیں جاری نہ رکھ سکا۔ لکھا کچھ نہیں گیا۔

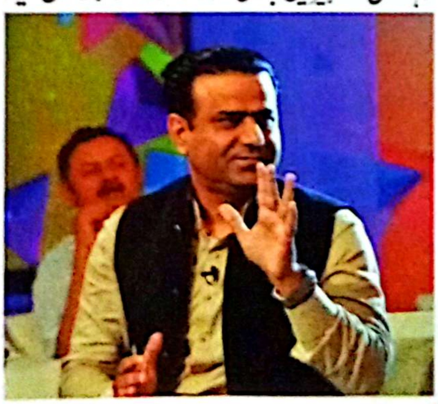

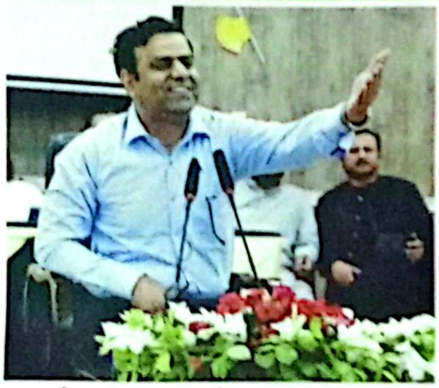

2019 میں پھر میں باقاعدہ نصیر احمد صاحب کا شاگرد بن گیا اور ان سے رہنمائی لینا شروع کی۔ ان کی رہنمائی لے کر پھر باقاعدہ شاعری دوبارہ شروع کی۔ لیکن ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب آپ کا شوق آپ سے کہتا ہے کہ اب کتاب آ جانی چاہیئے تو آپ کو کتاب لکھنی چاہیے۔ جب آپ گرو ہو رہے ہوتے ہیں تو آپکے اندر بہت سی میچور چیزیں ہوتی ہیں جو آپ کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جیسے جیسے آپ آگے جاتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی کتاب آنی چاہئے جس میں ایسی نظمیں، غزلیں ہوں جس سے ادب کے اندر اضافہ ہو۔ اس وجہ سے ابھی کوئی کتاب لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر کبھی ارادہ ہوا تو انشاءاللہ ضرور لکھیں گے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

MONTHLY Arzang LAHORE

جولائی 2025ء جلد 26 شمارہ 7

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلسِ مشاورت
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ ''ارژنگ'' کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت و سلام ' 2

مضامین:
- سوویت یونین میں اقبال شناسی / پروفیسر فتح محمد ملک ' 5
- یارمن رحیم یار......خان / مستنصر حسین تارڑ ' 8
- میں احمد ہمیش ہوں / ڈاکٹر یونس جاوید ' 18
- ادب اور فلسطین/ ڈاکٹر جمال نقوی ' 23

گوشۂ طنز و مزاح:
- آپ کا کیا خیال ہے؟ / عطاء الحق قاسمی ' 25
- میرزا مُفتہ / ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ' 27

شعری گوشے: نذیر قیصر ' سلیم کوثر 30 تا 31
- مال گاڑی میں امانتیں / علامہ عبدالستار عاصم ' 32
- خودمختار عورت / لبنیٰ صفدر ' 35
- اردو ادب اور عامر بن علی / فائق احمد ' 36
- شعور کا شاعر......ڈاکٹر راجہ غلام اصغر طاہر / ڈاکٹر علی احمد شیرازی ' 37
- بقیہ انٹرویو / جی۔اے نجم ' 39

افسانے:
- کھلی دھوپ اُجلتے سائے / اسد محمد خاں ' 42
- محبت کے رنگ / سیما پیروز ' 43
- گیٹ ویل سون (Get Well Soon) / رابن سیموئیل گل ' 47
- جیت / عالیہ ذوالقرنین ' 50

سفرنامہ
- اس بلا سے نجات ممکن ہے / عامر بن علی ' 52
- شاعری ' 53
- ادبی تقریبات ' 55

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

CamScanner

حمد

جونہی منظر میں حروفِ کن فکاں روشن ہوئے
ہر زمیں روشن ہوئی، سب آسماں روشن ہوئے
اِذن سے اُس کے ہی تاریکی بھی رکھتی ہے وجود
اُس نے جب چاہا،وہیں سارے جہاں روشن ہوئے
منبعِ نورِ ازل نے جب اشارہ کر دیا
سارے منظر از مکاں تا لامکاں روشن ہوئے
گونج اُٹھی جب تہجد کی اذاں اس شہر میں
اہلِ ایماں جاگ اُٹھے،سارے مکاں روشن ہوئے
حمد باری دل کی دھڑکن میں جونہی شامل ہوئی
قمقمے کتنے سرِ اشکِ رواں روشن ہوئے
اک انوکھی روشنی مجھ میں سرایت کر گئی
ذکر سے اُس کے مرے لفظ و بیاں روشن ہوئے
حمد کہنے کی سعادت مل گئی مجھ کو نسیم
جگمگائی روح، میرے جسم و جاں روشن ہوئے

نسیمِ سحر/راولپنڈی

نعت

سرورؐ دو جہاں ، آپؐ کا ذکر ہے
آسماں آسماں آپؐ کا ذکر ہے
منزلوں منزلوں آپؐ کے تذکرے
کارواں کارواں آپؐ کا ذکر ہے
آپؐ کا ذکر ہے ، زندگی زندگی
وجہِ تسکینِ جاں آپؐ کا ذکر ہے
پھول ، شبنم ، صبا آپؐ کی آیتیں
گلستاں گلستاں آپؐ کا ذکر ہے
اُس کی آنکھوں میں ہے طور کی روشنی
جس کے دل میں نہاں آپ کا ذکر ہے
کائناتوں کا عنواں ہے نام آپؐ کا
داستاں داستاں آپؐ کا ذکر ہے
کیوں نہ ہوں میری باتوں میں شیرینیاں
نُطق پر مہرباں آپ کا ذکر ہے
خامشی ہو کہ عالم ہو تقریر کا
شیوۂ عاشقاں آپؐ کا ذکر ہے
حشر میں کام آئے گا نام آپؐ کا
بخششِ عاصیاں آپؐ کا ذکر ہے
میرے ہاتھوں پہ سورج بھی ہے، چاند بھی
جب سے لب پر رواں آپ کا ذکر ہے

منیر سیفی (مرحوم)

فکر و غمِ جہان سے مولا رہائی دے
دائم درِ حبیبؐ کی مجھ کو گدائی دے
اِک آرزو مچلتی ہے سینے میں بار بار
ہر روز مجھ کو گنبدِ خضریٰ دِکھائی دے
وہ اسمِ پاک دھڑکنوں میں بس گیا ہے اَب
سنتا ہوں جب بھی اسمِ محمدؐ سُنائی دے
نظروں کو بھا گیا ہے اُسی شہر کا جمال
دیکھوں جدھر بھی شہرِ مدینہ دِکھائی دے
تسکینِ جاں ملے مجھے ذِکرِ حبیبؐ سے
ہر لحظہ مجھ کو نامِ محمدؐ سنائی دے
ہر پَل ہوں اُن کی دید کی خاطر میں بے قرار
اے کاش مجھ کو صورتِ آقاؐ دکھائی دے
لاریب سائے دور ہوں رنج والم کے سب
آقاؐ کا نام لے کے جو بندہ دُہائی دے
کُھل جائے چشمِ دل مری صدقے حضورؐ کے
پنہاں ہے جو نظر سے وہ دنیا دکھائی دے
عشقِ نبیؐ نے کر دیا دنیا سے بے نیاز
ہر گام مجھ کو منزلِ عقبیٰ دِکھائی دے
حُسنِ ازل نے جس کو بنایا بہ اہتمام
پیکر وہ نور کا کبھی مجھ کو دِکھائی دے
اختر میں جی رہا ہوں اسی آرزو میں اَب
اِک بار اُنؐ کی صورتِ زیبا دِکھائی دے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

عاشق کبھی محبوب سے غافل نہیں ہوتے
ہو لاکھ حسیں وہ کبھی مائل نہیں ہوتے
جو عزمِ مصمم ہے درِ یار کے دل میں
تو راہ میں پتھر کبھی حائل نہیں ہوتے
گر پیشِ نظر ہے نہیں محبوب کی منشاء
اہدافِ محبت کبھی حاصل نہیں ہوتے
گردن تو کٹا سکتے ہیں محبوب کی خاطر
اغیار کی صف میں کبھی شامل نہیں ہوتے
سرکارِ مدینہؐ کے جو دامن میں چھپے ہوں
پھر نجدی دلیلوں سے وہ قائل نہیں ہوتے
اس شان کے مظہر ہیں مدینے کے بھکاری
شاہانِ زمانہ کے وہ سائل نہیں ہوتے
طیبہ کی محبت کے چڑھے رنگ نرالے
جاوید کبھی رنگ یہ زائل نہیں ہوتے

جاوید منظور/لاہور

سلام

غم و ابتلائے حسینؑ کا ابھی اختتام نہیں ہوا
مرے نینوا کے مسافرو! یہ سفر تمام نہیں ہوا
ابھی قافلہ ہے رواں دواں، ابھی نبضِ وقت نہیں تھمی
ابھی راستے میں پڑاؤ کا کوئی اہتمام نہیں ہوا
سرِ رہ گزر ہے مکالمہ، ابھی اک امیرِ سپاہ سے
ابھی سنگ موم نہیں بنا ابھی حُر غلام نہیں ہوا
ابھی رنگ سرخ نہیں ہوا، کسی موجِ نہرِ فرات کا
ابھی کوئی خیمہ نہیں جلا، ابھی وقتِ شام نہیں ہوا
جو شہید ہے وہ شہید ہے، جو یزید ہے وہ یزید ہے
فقط اپنے قصر و سپاہ سے کوئی نیک نام نہیں ہوا
مرے تشنہ لب کے عروج تک مہ و مہر بھی نہ پہنچ سکے
مرے سُرخرو کے مقام کا کوئی اور امام نہیں ہوا

اعتبار ساجد/لاہور

میں کیا بتاؤں کیسا نجیب و متین ہے
دربان جس گھرانے کا رُوح الامین ہے
قدسی اُتر رہے ہیں حضوری کے واسطے
پسرِ شہہِ عرب یہاں مرقد نشین ہے
ظلمت ڈبک گئی ہے کہیں جس کے نور سے
نوکِ سناں پہ شخص وہ کتنا حسین ہے
اُس دین کی بنا میں لہو ہے حسینؑ کا
ادیانِ کائنات میں جو بہترین ہے
ایزدؔ سبیلِ خاکِ شفا ہے جہاں کا فیض
ایسی بہشت کرب و بلا کی زمین ہے

ایزد عزیز/لاہور

رکھتی ہے پاس خلق خدا خاکِ کربلا
کیونکہ ہے ہر مرض کی دوا خاک کربلا
یوں ہی جبیں سے لوگ تجھے چومتے نہیں
پاتے ہیں لوگ تجھ سے شفا، خاکِ کربلا
ہاں راستہ دکھائے گی جنت کا یہ تجھے
جا تُو کہیں سے ڈھونڈ کے لا خاکِ کربلا
سجدہ جو لوگ دیتے ہیں اُس خاکِ پاک پر
ان کو یہ بخشتی ہے بقا خاکِ کربلا
اس میں مرے حسینؑ کا شامل ہے خون پاک
کیسے ہو پھر اسدؔ سے جدا خاکِ کربلا

اسد رضوی/فرانس

وہ حوصلے کہ جو بِکھرتے نہیں شکستوں میں
اُبھرتے دیکھ اُنھیں حُر سے جاں بدستوں میں
سفر شہادتِ سیّد کا یاد ہو تو کھلتے
قیام کرتے ہیں کیسے ستم پرستوں میں
جو سر اُٹھے سر نوکِ سناں علم ہو کر
کس اوجِ ہست پہ پہنچے وہ چند جستوں میں
سر فرات زماں اب بھی کربلا ہے جہاں
وہی ہے موجِ حسینیؑ علیؑ کے مستوں میں
دوام اُن کو کہ بچپن میں بھی رہا روشن
نصابِ صدق و صفا جن کے شوق بستوں میں
سلام اُن پہ لہو جن کا آج بھی عالیؔ
کیے ہوئے ہے چراغاں وفا کے رستوں میں

جلیل عالی

دشتِ غربت میں لہو روتا ستارہ دیکھے
آنکھ میں ضبط کہاں ایسا نظارہ دیکھے
ہر نفس پر ہے ترے نقشِ یقیں کا پرتو
چاہے احساس کا منظر کوئی سارا دیکھے
جانے کس وقت رُکے گی یہ ہوائے وحشت
موسم غم ترے اَبرُو کا اشارہ دیکھے
موج در موج اُمڈتی ہے جہاں خواہشِ زیست
اپنے سینے میں وہیں پیاس کنارہ دیکھے
سر پہ جب دُھوپ مسلسل ہی ٹھہر جاتی ہے
تب مرا دشتِ بدن صبر تمہارا دیکھے
پیاس بھی، جبر بھی اور بے سرو سامانی بھی
ایسا منظر بھلا کیسے کوئی سارا دیکھے
غم اُترتے ہیں جب عاشور کی رُت میں آذرؔ
ایسے عالم میں کوئی رنگ ہمارا دیکھے

جنید آذر/اسلام آباد

کرم کے بادل برس رہے ہیں دوام اُس پر سلام اُس پر
سلام اُس پر کہ فیض رب کا ہے عام اُس پر سلام اُس پر
وہ شاکر ایسا لٹا کے اپنا گھرانہ کرتا ہے شکر اُس کا
وہ صابر ایسا کہ صبر کا اختتام اُس پر سلام اُس پر
بہادر ایسا ذہین ایسا کہ یاد تازہ ہوئی علیؑ کی
حسین ایسا حُسینؑ جچتا ہے نام اس پر سلام اُس پر
وہ زیرِ خنجر نمازی ایسا کہ آج تک ناز کر رہے ہیں
رکوع اُس پر، سجود اُس پر، قیام اُس پر، سلام اُس پر
وہ ایسا مسند نشیں کہ صبحیں خراج دے کر گزر رہی ہیں
غریب ایسا کہ آئی غربت میں شام اُس پر سلام اُس پر
یہ سانس چلتا رہے گا جب تک یہ دل دھڑکتا ہے جب تک
حسنؔ میں کہتا رہوں گا یونہی سلام اُس پر سلام اُس پر

حسن عباسی/لاہور

CamScanner

کسی قلم کا یہ حوصلہ تو نہیں کہ کربِ امامؑ لکھے
رسولِ اکرمؐ کی آلِ اطہر کا اس طرح قتلِ عام لکھے
مگر یہ مجھ سے ہر ایک اہلِ سخن پہ واجب ٹھہر گیا ہے
کہ لائقِ صد ہزار نفرت یزیدیت کا نظام لکھے
جو بھیک میں ملنے والے پانی سے بجھ سکے یہ وہ پیاس کب ہے
یہ ننھے اصغرؑ کے لب ہیں جن پر خدائے کوثر کے جام لکھے
یہ لکھنے والے پہ منحصر ہے بہ وقتِ تقسیم اوجِ منصب
کسی کے دامن پہ مصر لکھے، کسی کے پیروں میں شام لکھے
یہ آزمائش جھکا سکے گی کہاں جبینِ حسینؑ، ظالم!
ترے مقدر میں زخم ہیں نامرادیوں کے تمام لکھے
جو لکھنے بیٹھے کبھی مؤرخ مری عقیدت تو لازمی ہے
مرے گھرانے کو کربلا کے مجاہدوں کا غلام لکھے

سرور ارمان/نارووال

دل میں جب سے غمِ شبیرؑ بسائے ہوئے ہیں
قابلِ رشک مقدر کو بنائے ہوئے ہیں
مدحتِ سبطِ پیمبرؐ میں جو مصروف ہیں ہم
پھول یہ اُن کی محبت کے کھلائے ہوئے ہیں
دھیان ہٹتا ہی نہیں کرب و بلا سے میرا
اس طرح سے وہ مرے ذہن پہ چھائے ہوئے ہیں
آخرت میں مری بخشش کی ضمانت ہوں گے
یہی آنسو جو مری آنکھ میں آئے ہوئے ہیں
اُن مصائب کی کہانی مجھے بھولے کیسے
جن کے منظر مری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں
حوصلہ دیکھ براہیمؑ! مرے مولاؑ کا
نوجواں بیٹے کے لاشے کو اُٹھائے ہوئے ہیں
گو بہت دور ہیں ہم روضۂ زینبؑ سے رضا
اُن کی یادوں کے دیے گھر میں جلائے ہوئے ہیں

علی رضا/ساہیوال

زمیں حسینؑ کی ہے آسماں حسینؑ کا ہے
زماں مکاں یہ جہاں وہ جہاں حسینؑ کا ہے
میں آیا بابِ جناں پر تو یہ صدا آئی
اسے نہ روکو کہ یہ مدح خواں حسینؑ کا ہے
شہیدِ تشنہ کی ہے ملکیت میں کوثر بھی
جہاں کہیں بھی ہے آبِ رواں حسینؑ کا ہے
کوئی بھی رُت ہو، کوئی بھی جہاں، کوئی بھی وقت
پیامِ صدق و صفا جاوداں حسینؑ کا ہے
جو یاد رہتی ہے دل میں اسی امام کی ہے
جو نام رہتا ہے زیبِ زباں حسینؑ کا ہے
اسی کے صدقے میں بجھتی ہے پیاس آنکھوں کی
وہی جو قافلۂ تشنگاں حسینؑ کا ہے
دُرود پڑھتا ہوں رہتا ہوں سُرخرو یاسر
کرم یہ مجھ پہ مرے مہرباں حسینؑ کا ہے

علی یاسر

شہیدِ حق کا بیاں لا الٰہ الا اللہ
حسینیت کا نشاں لا الٰہ الا اللہ
زمینِ کرب و بلا پر فرازِ نیزہ سے
بُریدہ سر کی اذاں لا الٰہ الا اللہ
جہاں یزید وہاں کاروبارِ فسق و فجور
جہاں حسینؑ وہاں لا الٰہ الا اللہ
بجھے چراغ سے اُٹھتا ہوا شبِ عاشور
پکارتا ہے دھواں لا الٰہ الا اللہ
ہے سرِّ اوجِ عبادت، حسینؑ کا سجدہ
ہے رازِ کون و مکاں لا الٰہ الا اللہ
ثبوتِ عظمتِ حق، جذبۂ دلِ شبیرؑ
پیامِ خونِ رواں لا الٰہ الا اللہ
نہ تخت و تاج کی خواہش نہ جاہ و منصب کی
وظیفۂ دل و جاں لا الٰہ الا اللہ
لہو حسینؑ کا کرتا رہے گا ذکرِ خدا
"بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ"
بدن میں تیر، قفا پر ہے خنجرِ قاتل
مگر ہے وردِ زباں لا الٰہ الا اللہ
یہی حسینؑ سے قیصرؔ کے دل نے سیکھا ہے
علاجِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

ڈاکٹر قیصر عباس زیدی/برطانیہ

ہر شمع کی لو میں ڈھل رہا ہے
بجھ کر بھی چراغ جل رہا ہے
کیا زندہ سفر ہے کربلا کا
ہر دور کے ساتھ چل رہا ہے
شاید ہے یزید عصر جس کو
کردارِ حسینؑ کھل رہا ہے
یہ جیت عجیب ہے کہ ظالم
افسوس سے ہاتھ مل رہا ہے
اِک شخص کا انقلاب دیکھو
تاریخ کا رُخ بدل رہا ہے
اِک اسم ہے جس کی برکتوں سے
آ آ کے عذاب ٹل رہا ہے
گلزار ہوں شاخ اس شجر کی
کٹ کر بھی جو پھول پھل رہا ہے

گلزار بخاری/لاہور

CamScanner

سوویت یونین میں اقبال شناسی

پروفیسر فتح محمد ملک/اسلام آباد

علامہ اقبال نے اپنی دانش نورانی کی روشنی میں سوویت یونین کے قیام کا پر جوش خیر مقدم کرتے ہوئے توقع ظاہر کی تھی کہ یہ اشتراکی انقلاب ''لاسلاطیں لاَ کلیسالاَ اِلٰہ'' کے مراحل سے آگے بڑھتے ہوئے اِلا اللہ کی منزل پر آ پہنچے گا مگر افسوس صد افسوس کہ روسی اشتراکیت نفی کے مقام سے اثبات کی جانب رواں دواں نہ رہ سکی نتیجہ یہ کہ بالآخر مٹ کر رہ گئی ۔روس کا یہ اشتراکی انقلاب لا کے مقام نفی ہی کو اپنی منزلِ مقصود قرار دے بیٹھا نتیجہ یہ کہ سٹالن ازم نے اقبال کی اس پیش گوئی کو سچ ثابت کر دکھایا۔اقبال نے اپنی شعرۂ آفاق تخلیق 'جاوید نامہ' میں کیا خوب کہا ہے:

هم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ
بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس راقلب و جگر گردیده خوں
از ضمیر ش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زدست
تیز نیشے بر رگِ عالم زدست
کردہ ام اندر مقاما تش نگہ
لا سلاطیں لا کلیسا لا اِلٰہ
فکرِ اودرتند بادِ لا بماند
مرکب خودرا سوئے الّا نراند
در مقامِ لا نیا ساید حیات
سوے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا سازو برگِ امتاں
نفی بے اثبات مرگِ امتاں

اس ''نفیٔ بے اثبات'' نے روس میں اشتراکیت کے نظام کو ناکام بنا کر رکھ دیا۔ اب آیئے سوویت دانشوروں کی اقبال شناسی کی جانب۔

سوویت دانشوروں نے اقبالیات کے مطالعے کو ایک نئی پہنائی سے روشناس کرایا ہے۔ مغربی مستشرقین، اقبال کے فکر و فن پر تصوف کے حوالے سے بحث کرتے ہیں تو روسی دانشور سامراج کے حوالے سے ۔دنیائے مغرب کے بیشتر اقبال شناس اقبال کے مخصوص زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر مجرد تصورات کی بھول بھلیوں میں گم ہیں تو اقبال کے سوویت شارحین اور نقاد سامراج دشمنی اور انقلاب پسندی کو اقبال کے سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو' کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔سوویت مفکروں اور ادبی تنقید نگاروں کا نمایاں ترین کارنامہ یہ ہے کہ وہ اقبال کے فکر و فن کو اقبال کے عہد اور اقبال کے فوری گرد و پیش کی ٹھوس حقیقتوں کے سیاق و سباق میں رکھ کر سمجھنے میں کوشاں رہے۔یوں وہ ایک ایسے مقامِ نظر کو دریافت کر پائے ہیں جہاں سے اقبال کا آفاقی قد و قامت اپنے سارے مقامی رنگوں اور اپنی تمام تر زمانی رعنائیوں سمیت جگمگاتا نظر آتا ہے۔

سوویت یونین میں اقبال شناسی ایک مسلسل اور تدریجی ارتقا کی آئینہ دار ہے۔تردید و تعصب سے شروع ہونے والا یہ سفر بتدریج اجتہاد اور وسیع النظری کی جانب بڑھ رہا ہے...... رفتار ہے اس کی کبھی آہستہ کبھی تیز...... مگر اس میں سائنسی حقیقت پسندی سے پھوٹنے والی بلا کی استقامت ہے۔گزشتہ بیس برس کے دوران وقتاً فوقتاً جو علمی کاوشیں سامنے آتی رہی ہیں، اُن پر ایک نظر ڈالیں تو دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ اقبالیات اور پاکستانیات کے باب میں سوویت ماہرین میں باہمی اختلاف نظر موجود ہے۔ اور دوم یہ کہ علمی تجسس اور تحقیقی لگن کی بدولت سوویت دانشوروں کے تجزیوں اور محاکموں میں مسلسل خوش آئند تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان کا اندازِ نظر جامد نہیں حرکی ہے اور وہ وسعتِ نظر اور وسعت مطالعہ کے زیرِ اثر اپنی رائے کو بدلنے پر قادر ہیں۔

مادام پولونسکایا اسلام اور خصوصاً ہندی اسلام کی سنجیدہ اور زیرک سکالر ہیں۔انھوں نے اقبال کو مسلم نیشنلزم کی آئیڈیالوجی کے عظیم ترین نظریہ ساز اور رہنما کے طور پر سمجھا اور پرکھا ہے۔اول اول ان کے ہاں مسلم قومیت کے نظریے اور اس کے علم برداروں کے فکری کارناموں کے تجزیے میں تعصب اور تقلید کا رنگ گہرا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی ترقی پسندوں ......ڈاکٹر اشرف، پروفیسر مکرجی اور سجاد ظہیر کی تقلید میں انھوں نے بھی مسلم قومیت کی بجائے مسلم فرقہ واریت کی اصطلاح استعمال کی۔ یوری گانگوفسکی کے ساتھ مل کر پاکستان کے ابتدائی دس سالوں کی تاریخ' قلم بند کرتے وقت انھوں نے تحریکِ پاکستان کو رجعت پسندی کا تمغہ دیا، دو قومی نظریے کو برطانوی سامراجیوں کی اختراع قرار دیا اور اقبال کو فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کا اہم ترین مفکر بتایا مگر جلد ہی ہندوستانی ترقی پسندوں سے مستعار یہ سکہ بند تصورات سائنسی تجزیے اور علمی تحقیق کی بدولت منقلب ہونے لگے۔

صرف دو برس بعد پولونسکایا نے اپنی مستقل تصنیف ''برصغیر کی عمرانی فکر میں مسلمانوں کے رجحانات'' (مطبوعہ ۱۹۶۳ء) میں مسلم فرقہ واریت کی بجائے مسلم قومیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے لکھا کہ: ''اقبال کی عظیم الشان شعری اور فکری روایت کو ابھی تک کسی شارح کا انتظار ہے۔'' اپنی ذہنی نشوونما کے اس مرحلے پر پولونسکایا نے اقبال کی شخصیت کو تین ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ اس کے نزدیک سیاسی اقبال، فلسفی اقبال اور شاعر اقبال کسی ایک شخصیت کے نام نہیں۔ فلسفی اقبال انسان دوست ہے، شاعر اقبال ایک غلام ملک کا مغنی ہے جو آزادی کے آتشیں نغمے تخلیق کر رہا ہے اور سیاسی اقبال رجعت پسندی اور فرقہ پرستی کا شکار ہے۔

چار برس بعد ایم۔ ٹی۔ سٹیپانیاں کی کتاب ''پاکستان: سوشیالوجی اور فلاسفی'' کے تعارف میں پولونسکایا نے مسلم قومیت کی آئیڈیالوجی کا فکرِ اقبال کی روشنی میں تجزیہ کیا تو انھیں اس کے آئینے میں مسلمانوں کی قومی آزادی و خودمختاری کی تمناؤں اور نوآبادیات و سامراجی شکنجوں کو توڑنے کے عزائم کی جھلک نظر آئی۔ مزید چار برس بعد (۱۹۷۱ء میں) پولونسکایا نے ''مسلم نیشنلزم کی آئیڈیالوجی'' کے عنوان سے ایک جامع اور پرمغز مقالے میں اقبال کے سیاسی مسلک اور مسلم قومیت کے تصور کو اپنے تمام تر جدلیاتی تضادات کے باوجود ایک قطعی، متعین اور مؤثر سامراج دشمن رجحان کا حامل اور سماجی عدل و مساوات کا داعی ٹھہرایا:

''اقبال کے فلسفیانہ تصورات نے اسے اس نتیجے تک پہنچایا کہ اس کے آزادی و مساوات کے تصورات صرف ایک اسلامک ریاست میں ہی برگ و بار لا سکتے ہیں۔ سو، مسلمانانِ ہند کے سامنے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ راستہ قومی حقِ خوداختیاری کی بنیاد پر پاکستان کے قیام کا راستہ ہے۔ نظریہ پاکستان، مسلم قومیت کے تصور کا منطقی نتیجہ ہے اور اقبال کے نزدیک مسلم قومیت کا تصور ایک واضح اور قطعی استعمار دشمن آئیڈیالوجی ہے جس کے رگ و پے میں سماجی انصاف کے مذہبی تصورات رواں ہیں...... اپنے تصور، کائنات کے تضادات اور اندرونی کمزوری کے باوجود اقبال اپنے مذہبی، فکری، سیاسی اور فنی عمل کے تمام مرحلوں پر مسلمانانِ ہند کی امیدوں اور تمناؤں کے ترجمان، ان کے خواب و خیال پر حکمران، ایک پُرجوش محبِ وطن، نوآبادیاتی نظام اور انسان پر انسان کے کسی بھی شکل میں ظلم کے خلاف جہد آزما ایک سرفروش مجاہد اور آزادی و انسانیت کے علمبردار رہے ہیں۔''

پولونسکایا ایک وسیع تر علمی اور تحقیقی کینوس پر اقبال کے فنی و فکری کمالات کے نقوش اُجاگر کرتی ہیں، ان کے نزدیک:

''اقبال اسلام کے وہ پہلے ریفارمر ہیں جنھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی سامراج دشمن قومی امنگوں کو روحانی پیرایہ اظہار بخشا بلکہ جنھوں نے اسلام کے اندر سماجی ترقی کا ایک ایسا راستہ ڈھونڈا جو مغرب کے سرمایہ دارانہ راستے سے الگ تھلگ اور قطعی مختلف ہے۔ اس کے سماجی نظریات میں عوامی مساوات کے مثالی تصورات کی جھلک موجود ہے اور ایک مذہبی ریفارمر اور مسلمان نظریہ ساز کی حیثیت سے اس کی اولین اہمیت اسی بات میں پوشیدہ ہے۔''

پولونسکایا کی اقبال شناسی کا مرکزی حوالہ اسلام اور پاکستان ہے۔ وہ اقبال کے تصورِ اسلام اور تصورِ پاکستان کی ہمدردانہ تفہیم سے اپنے علمی کام کی ابتدا کر کے رفتہ رفتہ پرجوش تحسین کی منزل تک آ پہنچی ہیں۔ مارکسی فلسفے پہ اپنے محکم ایمان اور مارکسی جدلیات سے اپنی اٹل وابستگی کے باوجود وہ تاریخ انسانی میں اسلام کے انقلابی کردار کی معترف بھی ہیں اور اقبال کے تصورِ اسلام میں انسانیت کے درخشاں مستقبل کی جھلک بھی دیکھ سکی ہیں:

''یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال مسلمان معاشرے کو صرف مذہبی معاشرہ نہیں سمجھتا بلکہ اس کے نزدیک اسلام ایک طرزِ حیات ہے۔ اس طرزِ حیات کا سرچشمہ ایک ایسا ہمہ گیر فلسفہ حیات ہے جس نے سماج اور قانونی اداروں اور واضح تاریخی اور تہذیبی روایات کو جنم دیا ہے۔ اقبال کے تصورِ مسلم قومیت کا مذہبی ناروداری اور تنگ نظر فرقہ آرائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم قومیت کے نظریے کا پرجوش رہنما اور ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے ہمیشہ وطن پر غیر ملکی تسلط کے خلاف مشترکہ جدوجہد کا راستہ اپنایا ہے۔ اپنے فکر و عمل کے کسی بھی مرحلے پر اقبال نے ہندوؤں کے خلاف برطانوی سامراجیوں سے اتحاد کا تصور تک گوارا نہ کیا۔''

اس تصورِ اسلام نے اقبال کی شاعری اور فلسفے میں سرمایہ داری اور ملوکیت کے خلاف جدوجہد اور انسان کی مکمل مادی اور روحانی آزادی کے خوابوں کو جو محوری حیثیت بخشی ہے اس کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اقبال کو اپنے عہد کی ترقی پسند ترین شخصیات میں سے ایک ٹھہراتی ہیں۔

CamScanner

پولونسکایا کی عملی لگن اور حقیقت بیں نظر کا فیضان سوویت یونین کے متعدد ماہرین اقبالیات، ماہرین اسلامیات اور ماہرین علوم شرقیہ کے ہاں جاری ہے۔ عبداللہ غفار روف اور نتالیا پریگورینا نے جہاں اقبال کی شاعری اور فلسفے میں انسان دوستی کے رجحانات پر روشنی ڈالی ہے وہاں سٹیپانیاں نے اپنی کتاب ''پاکستان: فلاسفی اور سوشیالوجی'' (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) میں اقبال کے سیاسی مسلک میں نو آبادیت اور سامراجیت کے خلاف شدید بغاوت کے تصورات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ سٹیپانیاں نے ''مقدر پرستی کی موت'' کے عنوان سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہونے والے مقالے میں ترکِ دنیا اور انفعالی تصوف کے مروجہ تصورات پر اقبال کی شدید ترین تنقید کا حوالہ دیتے ہوئے اقبال کو انسان کی آزادی عزم و عمل کا نقیب اور تخلیقِ مسلک میں مصروف انسان کو خدا کا ساتھی قرار دینے والا ایک ایسا شاعر اور مفکر ثابت کیا جس نے خیر و شر کے تصورات کو انقلابی معنویت سے لبریز کر دیا ہے۔

نکولائی آنی کیف کی کتاب ''محمد اقبال: ممتاز مفکر اور شاعر'' ۱۹۵۹ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ ان کے نزدیک ''اقبال فلسفیوں کے شاعر اور شاعروں کے فلسفی ہیں'' اور بجا طور پر دانتے، شیکسپیئر، گوئٹے، ٹالسٹائی اور ٹیگور کی صف میں ایک مقامِ امتیاز کے حامل ہیں۔ نکولائی آنی کیف اور پولونسکایا میں جن امور کا اتحادِ نظر پایا جاتا ہے۔ ان میں اقبال کا تصورِ اسلام اور فکرِ اقبال پر مغربی اثرات کی نوعیت نمایاں ترین ہیں۔ آنی کیف نے اقبال کے فلسفۂ خودی کے موضوع پر دادِ تحقیق دیتے وقت ''ان ترقی پسندوں اور نام نہاد ترقی پسندوں'' پر کڑی تنقید کی ہے جو ''اقبال کے فکر و فن پر صرف اس بناء پر رجعت پسندی اور قدامت پرستی کا الزام دھرتے ہیں کہ اقبال نے بقول ان کے صرف مسلمانوں کو مخاطب کیا اور اس کے نظریات و استدلال اور مشرق کی بیداری کے تصورات قرآن سے پھوٹے ہیں۔'' افریشیائی ممالک میں قومی آزادی و خود مختاری کی تحریکوں میں مذہب کے عمل دخل پر بحث کے دوران آنی کیف کہتا ہے:

''ایک اعتبار سے اقبال کے اسلامی آہنگ نے ہندوستان کی زندگی میں ایک عظیم کردار سرانجام دیا ہے۔ اس نے آزادی کی امنگوں کو پروان چڑھایا اور خاص طور پر ہمارے عہد میں تو یہ اسلامی آہنگ ہندی مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد کا علم بن کر لہرایا۔''

اقبال پر مغرب کے اثرات کی نشاندہی کرتے وقت نکولائی، آنی کیف، پولونسکایا کی ہمنوائی میں اقبال کے افکار و تصورات پر نہیں بلکہ اقبال کے فلسفیانہ اسلوب پر جدید سائنس اور فلسفے کی گہری چھاپ دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں اقبال نے اپنے فلسفیانہ تصورات کے اظہار کے لیے مغرب سے صرف جدید سائنسی اور فکری پیرایۂ اظہار اکتساب کیا ہے مگر ان کے تصورات و نظریات مغربی تصورات و نظریات سے مختلف اور بیشتر اوقات متصادم ہیں۔ آنی کیف کے نزدیک اقبال اور نیٹشے کے انسانِ کامل کے تصورات میں تطابق کی تلاش بے کار ہے۔ اقبال نے صرف مغرب کی بورژوا تہذیب پر نیٹشے کے حملوں کی تعریف کی ہے۔ ان کے انسان کے کردار اور مقام میں زمین و آسماں کا فرق ہے۔''

نکولائی آنی کیف، اقبال کے فلسفہ خودی کو سامراجی زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد میں مصروف محکوم قوم کی اندرونی ضرورت قرار دیتے ہیں۔ وہ فلسفۂ خودی اور تسخیرِ فطرت کے تصورات کو اقبال کے عہد کے مشرق بالخصوص ہندوستان میں جاری عملی سیاسی جدوجہد کی روشنی میں تفسیر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان تصورات کی ''آتشیں معنویت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ہم اس عہد کے فریب و سراب کے طلسم میں اسیر ہندوستان میں ان لوگوں کے طرزِ فکر و عمل پر غور کرتے ہیں جو عدم تشدد اور پرامن ذرائع سے فرنگی ملوکیت سے نجات کے پروگرام بنا رہے تھے۔''

آج کے سوویت ادبی نقاد اپنے مخصوص جدلیاتی زاویۂ نگاہ سے اقبال کے تصورِ کائنات میں مثالیت پسندی کی جو کمزوری اور نظامِ فکر میں انقلاب اور ارتقا کا جو تضاد دیکھتے ہیں اسے وہ ایک عظیم شخصیت پر ماحول اور ماضی کے ناگزیر اثرات سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بحیثیت فلسفی کے ناگزیر اثرات سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بحیثیت فلسفی اقبال کی عظمت کا راز، انسان کے ازلی، ابدی اور آفاقی مسائل کو تجرید اور ماورائیت کی دھند سے نکال کر اپنے گرد و پیش اور اپنے عہد کے ٹھوس حقائق کی روشنی میں سمجھنے اور اپنی ملی نشاۃِ ثانیہ کے تقاضوں کی نسبت سے ان پر غور و فکر کرنے میں مضمر ہے اور بحیثیت شاعر ان کی عظمت کا راز ایک توانا رجائیت کے ساتھ انفعالیت اور بے عملی کی مذمت کرنے اور عدم مساوات اور جبر و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں پنہاں ہے۔

''یارِ من رحیم یار......خان''

مستنصر حسین تارڑ/لاہور

''ہائیں یہ کشمیر کہاں سے آ گیا'' پیرو نے چونک کر کہا۔ اُس نے ابھی ابھی اپنے بوسیدہ اور پھسپھسے ہو چکے سگار کے دو کش لگائے تھے اور ذرا اونگھ میں چلا گیا تھا۔ مجھے شک ہوتا جاتا تھا کہ اُس کا یہ دیرینہ تاریخی سگار تمباکو کے پتوں کو لپیٹ کر نہیں بنایا گیا تھا بلکہ حشیش کی کسی بہت اعلیٰ نسل کے ریشوں سے تیار ہوا تھا ورنہ صرف دو کش لگانے سے انسان بے وزن ہو کر اک عالم بے خودی میں خلا میں تو نہیں تیرنے لگتا۔ بہر حال میں بھی تو سفر کی تھکاوٹ کی اونگھ میں تھا۔ چنانچہ میں بھی چونک گیا......

''کشمیر کیسے آ سکتا ہے پیرو، وہ تو شمال کی جانب ہے اور ہم جنوب کے مسافر ہیں۔''

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے موٹروے کے کنارے ایک بورڈ گزرتا دیکھا ہے اور اُس پر کشمیر لکھا تھا۔''

عادل نے اپنی سیاہ مرسیڈیس کے نیچے تیزی سے دفن ہوتی سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا ''کشمیر نہیں کشمور لکھا تھا''

''کشمور تو غالباً سندھ میں ہے۔''

''غالباً نہیں، یقیناً کشمور سندھ میں ہے'' وہ بیزاری سے بولا۔

''ابھی ابھی ایک اور سائن گزرا ہے کہ اب آپ باب الاسلام میں داخل ہو رہے ہیں، تو ہم سندھ میں ہیں۔''

''پر ہم سندھ میں کیوں ہیں؟''

''اس لیے کہ ہم رحیم یار خان جانے والی شاہراہ کو مس کر گئے ہیں اور سندھ میں داخل ہو گئے ہیں۔ موٹروے پر جب کہیں واپسی کے لیے یوٹرن آیا ہم وہاں سے واپس ہوں گے۔''

''اگر یوٹرن نہ آیا تو......''

''پھر کراچی......'' عادل کا موڈ یک دم بہتر ہو گیا۔ وہ انگریزی کا محاورہ ہے ناں کہ جب ریپ ناگزیر ہو جائے تو پھر اسے انجائے کرنا چاہیے، تو آپ فی الحال سندھ کی لینڈ سکیپ کو انجائے کیجیے۔ جب تک کہ یوٹرن نہیں آ جاتا۔''

''اچھا خیال ہے۔'' پیرو صاحب صورت حال کی نزاکت سمجھ گئے۔ بجھے ہوئے سگار کو بمشکل سلگایا، دو کش کھینچے اور شانت ہو گئے۔'' تو میاں عادل اس لینڈ سکیپ کو کیسے انجائے کیا جائے؟

''آپ غور کیجیے کہ اس سرزمین پر جگہ جگہ، کھیتوں کے کناروں پر، کھیتوں کے درمیان میں بے شمار کھجور کے درخت دکھائی دے رہے ہیں، یہ قدرے بے ترتیب ہیں، کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کی فوج جہاں جہاں گئی، وہاں کھجوریں کھاتی گئی اور اُن کی گٹھلیاں پھینکتی گئی۔''

''ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ باہر کے لوگ ہمارے ہاں آئیں، کھجوریں خود کھائیں اور ان کی گٹھلیاں ہمارے لیے پھینک جائیں۔''

''تارڑ صاحب ان کھجوروں کا احترام ہم پر لازم ہے۔ یاد رہے کہ یہ عرب شریف کی ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جس روز محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا تھا، اُس روز پاکستان کی ابتدا ہو گئی تھی۔ بنیاد رکھی گئی تھی۔''

''یعنی کھجور کی گٹھلیوں سے بنیاد اُٹھائی گئی تھی۔ سبحان اللہ!!''

''پاک سرزمین شاد باد'' پیرو کا سگار بجھ چکا تھا ''ویسے کھجور کے درخت کی کتنی عمر ہوتی ہے۔ ہزار برس تو نہیں ہو سکتی۔''

''پیرو جی! تقدس کی عمر اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بس یقین محکم رکھئے اور انجائے کیجیے۔''

ہم سندھ میں چلے جا رہے تھے اور یوٹرن دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''ویسے ایک سوال اُٹھتا ہے۔'' عادل نے اپنے کاؤبوائے ہیٹ کا زاویہ درست کرتے ہوئے کہا کہ وہ اُس کے ماتھے پر اتنا جھکا ہوا تھا کہ موٹروے کے منظر کے درمیان حائل ہو رہا تھا اور وہ متوقع یوٹرن مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''جی اُٹھائیے۔''

''کیا اُٹھائیے۔'' عادل ہیٹ کا زاویہ درست کرنے کے دوران اپنا سوال بھول چکا تھا۔

''حضور آپ نے ارشاد کیا تھا کہ ایک سوال اُٹھتا ہے تو اُٹھائیے۔''

''اوہ ہاں......'' وہ ذرا کھسیانا ہو گیا ''یہ جو صوبہ سندھ کے آغاز میں باب الاسلام کا بورڈ آویزاں تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کفرستان سے آ رہے تھے اور اسلام کے دروازے میں داخل ہو گئے۔''

''عادل میاں! آپ کی دور رس نگاہوں کی داد دینا ہم پر لازم ٹھہرتا ہے۔ سوال واقعی اُٹھتا ہے۔ ویسے مینارِ پاکستان کو بھی دانشور حضرات نے پہلے یادگارِ پاکستان کا نام دیا تھا۔ پھر ہم جیسے کسی گھامڑ نے سوال اُٹھایا کہ حضور یادگار تو مٹ چکی تہذیبوں کی ہوتی ہے۔ آج بھی لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب جو ٹریفک سائن آویزاں ہے اُس پر ''یادگارِ پاکستان'' اس جانب، درج ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم یوٹرن سے واپس ہو کر سندھ کی حدود سے پنجاب میں داخل ہوں گے تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو گئے۔''

CamScanner

"توبہ توبہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو۔" پیرو اس صدمے کی تاب نہ لا کر اپنے بجھے ہوئے سگار کے دم لگانے کی سعی کرنے لگا۔

چنانچہ ہم باب الاسلام سے نکل جانے کے لیے یوٹرن کی آمد کے منتظر ہوتے گئے۔

ایک قدرے عمر رسیدہ سیاہ مرسیڈیس پیرانِ پیر پیرو، عادل میاں اور یہ حقیر فقیر بندۂ پُر تقصیر وغیرہ۔

ایک آڈی جانے کیوں ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

ایک ٹیوٹا...... صرف اس لیے چلی آ رہی تھی کہ اُس کے آگے ایک مرسیڈیس اور ایک آڈی چلی جا رہی تھی۔

ان تینوں کے تعاقب میں ایک کوسٹر رواں......

جس میں بھانت بھانت کے جانور اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں، کچھ منہ کھولے سو رہے تھے اور اُن میں ایک کے گلے میں ایک پھندہ تھا جو سفر کے دوران راحت کا سبب بنتا تھا۔ گمان ہوتا تھا کہ پھانسی کا ہے تبھی ان کے منہ کھلے تھے۔

موٹروے پر سفر کرنا گویا ایک لامتناعی خلا میں سفر کرنا ہے۔ نہ کسی آبادی میں سے گزر ہوتا ہے، نہ کسی قصبے کی بھیڑ بھاڑ میں راستہ بناتے ہیں، نہ کوئی ٹریکٹر ٹرالی اور نہ ہی سڑک کے کناروں سے یک دم نمودار ہوتی کوئی گدھا گاڑی عین آپ کی کار کے سامنے...... اور تو اور آپ کہیں رک کر گنڈیریاں بھی نہیں خرید سکتے۔ گویا یکسانیت کا ایک تسلسل جو موٹروے کے دونوں جانب کھیتوں کھلیانوں کی صورت میں چلا جا رہا ہے۔

موٹروے پر یہ قافلہ چلا جا رہا ہے اور اس کا سالار میاں عادل ایک زائر ہے جو ہمیں بھی اپنے بچپن کی زیارت دکھانے کے لیے جا رہا ہے۔

ہم رحیم یار خان جا رہے تھے۔

یہاں پر پھر سوال اُٹھتا ہے کہ ہم رحیم یار خان ہی کیوں جا رہے تھے۔ بھلا یہ کوئی جانے کی جگہ ہے۔ سردیوں کی کوسی کوسی دھوپ میں، نمی نمی دھند میں صبح سویرے اپنی رضائیاں چھوڑ کے، لاہور چھوڑ کر بندہ جائے تو مری جائے چاہے وہاں برف میں سرد ہو کر مر جائے۔ چلو ٹیکسلا چلا جائے اور ہری پور کے مالٹے کھائے اور جولیاں کے کھنڈروں میں وہ راہبانہ کوٹھڑی تلاش کرے جہاں کبھی ایک بودھ کا چراغ روشن ہوا تھا۔ رحیم یار خان کیوں جائے...... صرف اس لیے کہ عادل اپنے آبائی شہر کے لیے اُداس ہو گیا تھا۔ اُس نے کینیڈا اور امریکہ کا سفر اس لیے ترک کر دیا تھا کہ اُسے رحیم یار خاں بلاتا تھا کہ تم مجھے بھولتے جاتے ہو۔ میری گرد آلود گلیوں کو فراموش کر دیا جہاں نادانی کے دنوں کے عشق کی حدّت تمہارے بدن کو پھونکتی تھی۔ میری ریت کے ان ذرّوں کو بھی بھول گئے جو سورج کی تپش سے تمہارے نوخیز بدن میں بھی جوانی کی اولین چنگاریاں سلگاتے تھے۔ تمہارے بزرگوں کی ڈھیریوں کی مٹی بھی تمہارے لیے اداس ہے۔ مدت سے کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آیا۔ تم ہم کو بھی بھول گئے۔

چنانچہ عادل ریت اور مٹی میں مدفون اپنے بچپن اور نوخیز دنوں کو دریافت کرنے جا رہا تھا اور اُس نے ہمیں بھی مائل کر لیا تھا ورنہ رحیم یار خاں کون جاتا ہے۔ تو ہم جاتے تھے۔

بالآخر موٹروے پر وہ یوٹرن دکھائی دے گیا اور ہم کشمور کو سلام کر کے وہاں سے واپس ہو گئے۔ کچھ دیر بعد باب الاسلام سے خارج ہو کر پنجاب میں داخل ہو گئے اور پھر رحیم یار خان اُترنے والی شاہراہ پر اُترتے گئے۔ ہمارے ساتھ ہی شام بھی اُترتی گئی۔ ملگجی سے اندھیرے میں ملگجی سی روشنیاں مدھم ہو رہی تھیں۔ ہر شام کبھی بستیاں ایک جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ در و دیوار تاریکی میں مدغم ہوتے ہوئے، لوگ ہیولے سے آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہوئے اور ایک اُداسی جو شام کی پہلی ہوتی ہے اُس کے ساتھ اُترتی آتی ہے۔

اُس شام میں اور اُس اداسی میں درختوں میں گھرا ایک قبرستان، اک سوگواری لمبی جدائی کی۔ بچھڑ جانے کے دکھ، بھولتے ہوئے اُن پیاروں کے نقش جو اس قبرستان میں مدفون تھے اور یہ سب عادل کے چہرے پر اُس شام میں سائے سائے...... اُس کی اداسی ہم پر بھی تو اثر کرتی تھی۔ اُس کے دادا اور دادی کے مدفن دیکھ کر میرے اندر بھی ایک قبرستان کے دھندلکے چپکے سے چلے آئے جس میں میرے دادا اور دادی کی اب تو بے شناخت ہو چکی قبریں تھیں۔ وہ بھی تو مجھے بلاتی تھیں، دو برس پیشتر میں جو کالیاں گیا تو قبرستان کے کناروں پر کھڑے ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے۔ ان دونوں کے نشان تو کہیں تھے پر اُن کی شناخت مٹی میں مل چکی تھی۔ یوں وہ کسی بھی قبرستان میں ہو سکتے تھے۔ یہاں اسی دور افتادہ نیم صحرائی شہر کے کناروں پر اس قبرستان میں بھی عادل مجھے میرے دادا اور دادی کی قبروں تک لے آیا تھا۔

سوگواری ٹھہری رہی اور شام رُخصت ہو گئی، قبرستان رات کی سیاہی میں دفن ہوتا گیا۔ شجروں کے گھنے ذخیرے میں رات کا کوئی پنچھی کُوکنے لگا۔ اُس کُوک میں اک ہُوک تھی، ویسی جو میری عمر کے لوگوں کے بدن میں بولتی ہے کہ زندگی ڈوبنے والی ہے، آخری شعاعیں زرد ہو رہی ہیں اور اَب تو بجھتے نہ بنے، تو کیا کھویا کیا پایا میں کیوں تھا، کون تھا، کہاں جانا ہے۔ وہ ہُوک یہ سوال پوچھتی چلی جاتی ہے اور زرد شعاعیں ڈوبتی چلی جاتی ہیں۔

"توں کاہدا پٹواری تے منڈا میرا روئے انب نوں"

ہاں جی آپ کیسے پٹواری ہو کہ میرا بچہ آم کے

لیے روئے چلا جارہا ہے۔

پٹواری کی بڑی شان ہوتی ہے۔ گاؤں کے جاٹ کہا کرتے تھے کہ اوپر خدا اور نیچے پٹواری۔ پچھلے دنوں انتظامی امور کے لیے پٹواریوں کا ایک اجتماع ہوا تو اُن کی لینڈ روورز کے لیے پارکنگ کی جگہ کم پڑ گئی۔ چنانچہ گئے دن جب پٹواری کا منڈا آم کے لیے روتا تھا، اب اگر روتا تھا تو ایک لینڈ روور کے لیے روتا تھا۔

پر ہم تو نہ روتے تھے کہ پورے عرصے پر محیط ایک ڈائننگ ٹیبل پر پلاسٹک کے ڈونگوں اور طشتریوں میں سے ایسی مہکیں اور وہ بھی گرم گرم اُٹھتی تھیں کہ ہم جو بہت بھوکے ہو رہے تھے، بھکم بھانے ہو رہے تھے، سفر کے دوران سینڈوچ اور کافیاں پی پی کر دل جلاتے رہے تھے۔ ندیدے ہونے لگے، میز پر سجی خوراکوں کی خوشبو سے ذائقے کی کونپلوں سے اس پھوٹنے لگا۔ اگرچہ روشنی ناکافی تھی پر طرح طرح کے پکوانوں کو واضح طور پر دیکھنے کے لیے کافی تھی۔

پٹواری عادل کا بچپن کا یار تھا اور اُس نے عادل کے یاروں کے لیے رات کے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ یہ پٹواری بہت سادہ طبیعت کا، درویش منش سا لگتا تھا، کائیاں اور عیار نہ لگتا تھا جیسا کہ ایک پٹواری کو لگنا چاہیے۔ خوراکوں میں آبائی زمینوں کے خالص ذائقے تھے اور بچپن کی دوستیوں کے تڑکے لگے ہوئے تھے، اُس نے بتایا کہ جب عادل پہلے روز سکول آیا تو گھوڑے پر سوار آیا۔ صرف پہلے دن، بعد میں ابا جی نے کہا کہ پتر سکول اتنا دور نہیں، پیدل جایا کرو۔ چنانچہ عادل میاں پیدل ہو گئے۔

عادل کی خصوصی خواہش کے اقدام میں پٹواری بھائی نے اپنے ایک اب تک میری طرح حیات سکول ٹیچر کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ ماسٹر صاحب عطر چھلیل میں مہکتے آئے اور عادل اُن کے سامنے اُن کے احترام میں سر جھکا کر ایک بچے کی مانند بیٹھا رہا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اُس پرانے مکان سے باہر کھلی فضا میں آیا تو اُس رات میں ہلکی خنکی رچ رہی تھی اور ہوا میں تازگی سانس لیتی تھی۔ ہم جو لاہور کی آلودگی کے عادی تھے ہمیں تازگی میں سانس لینے میں دشواری ہوئی کہ اس میں جھانجھروں کی چھنک تھی۔ سانس لو تو بن بیاہی مٹیار کی کانچ کی چوڑیوں کی مانند پورا بدن کھنکتا تھا جیسے سکردو ایئرپورٹ پر جہاز سے باہر آتے ہوئے اُس خنک اور ستھری ہوا میں پہلا سانس ہوتا ہے۔

اُدھر کوئی باغ باغیچہ سا اندھیرے میں روپوش ہوتا تھا جہاں سے ایک اور طرح کے کھنک چھلکتی سنائی دیتی تھی اور کچھ نہیں تھی۔ بہت سی مسرت تھی جو اس کھنک میں شامل ہو کر ہم تک پہنچتی تھی۔ میں اپنے بوڑھے بدن کو سنبھالتا جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا اُدھر گیا۔ ماحول بھی نیم تاریک، گھاس بھی نیم تاریک لیکن ایک میز کے گرد بیٹھے لوگوں کے چہرے روشن روشن۔

خواجہ صالح نیم تاریکی میں ال پچینو گینگ کا ایک سرکردہ ممبر لگ رہا تھا۔ اپنی فرنچ کٹ داڑھی میں انگلیاں چلاتا ایک گہری آواز میں اپنی حیات کے تجربوں سے دیگر شرکا کو آگاہ کرتا مسکراتا تھا اور کم از کم آج کی شب تو صالح نہ تھا۔ اُدھر نسیم بادِ نسیم ہوا جاتا تھا۔

اور جو پیرو تھا وہ اپنے دیرینہ سگار کو بالآخر سلگا چکا تھا اور اُس میں سے دھواں اُٹھتا تھا۔ کیا دیکھنا کہ دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے یہ دھواں پیرو کے سگار سے اُٹھتا تھا۔ لگتا تھا کہ ہے ہوا میں شراب کی تاثیر اور بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی۔ یعنی ادھر تو سنا ہے کہ تیری محفل میں رت جگا ہے، ان تینوں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

عثمان پیرزادہ عرف پیرو اپنی متعدد دادیوں کے حوالے سے ایک نہایت خوش بخت شخص تھا۔ اُس کی دادیوں میں شکلوں اور نسلوں کی بے حد ورائٹی تھی۔ اُس کی ایک دادی وزیرستان کی تھی اور یوں پورے وزیرستان میں ان کے کزن وغیرہ وافر تعداد میں پائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اکثر بوڑھے وزیری کا ملک اُس کے دادا وغیرہ ہو سکتے تھے۔ دوسری دادی سراسر انگریز تھی اور مرحوم دادا جان کی پہنچتی تھی اس لیے بھی کہ وہ انگریزی بولتی تھی اور دادا جان کی انگلش کی تصحیح کرتی رہتی تھی۔ پیرو کا کہنا تھا کہ جب اچھی سوتنوں کی مانند وزیری اور انگریز دادی آپس میں جھگڑتی تھیں تو انگریز دادی ٹھیٹھ پنجابی میں اُسے برا بھلا کہتی تھی۔ بھلا کم اور برا زیادہ کہتی تھی۔ میں قیاس کر سکتا ہوں کہ وزیری دادی اپنی انگریز سوتن کو پشتو میں کوستی ہوئی اور پھر پیرو کی اپنی دادی بھی تو تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پنجابی تھی۔ یوں پشتو، انگریزی اور پنجابی کا کیا شرانگیز یدھ پڑتا ہوگا۔ شاید ایک اور دادی بھی تھی میں بھول رہا ہوں۔ پیرو سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ ویسے مجھے تو پیرو کی قسمت پر بے حد رشک آتا ہے کہ اُس کے دادا کے گھر میں دادیوں کی کیسی کیسی ورائٹی تھی اور ایک ہم ہی ناداں ہیں کہ ایک ہی دادی پر قناعت کر گئے اور وہ بھی بیری کے درخت تلے چرخہ کاتتی ہوئی دیہاتی دادی۔

لاہور سے رحیم یار خاں بلکہ کشمور تک کی تھکن چپکے سے گھات لگائے بیٹھی تھی۔ وہ اب بدن میں اُترنے لگی۔ خاص طور پر میرے عمر رسیدہ بدن میں اور اس کے ہمراہ عمر بھر کی مسافتوں کی تھکن بھی شامل ہو گئی۔

قافلہ پھر سے رواں ہو گیا کسی کارواں سرائے کی تلاش میں۔ جہاں ہم یہ شب بسر کر سکیں۔ کسی ویرانے میں صحرا کے کناروں پر کہیں، میرے دل میں وسوسے تھے کہ کہیں ہماری رہائش کے بندوبست کسی اُجاڑ ریسٹ ہاؤس یا ایسے ہوٹل میں نہ ہوں جس کی دیوار پر لکھا ہوتا ہے کہ ہوا دار کمرے، فلش سسٹم کی سہولت اور پر ذائقہ کھانے محض وسوسے تھے کہ ہم جب بھی عادل

کی سرکردگی میں کہیں گئے تو بندوبست بقول اُس کے ''بہترین'' تھے۔ ویسے بھی وہ ہمہ وقت تشویش بھری نظروں سے مجھے جانچتا رہتا تھا کہ کہیں تارڑ صاحب زیادہ تھک تو نہیں گئے۔لڑکھڑا تو نہیں رہے۔ یوں بھی یہ رحیم یار خانی مہم خصوصی طور پر میری سہولت اور صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دی گئی تھی۔ میرے کچھ مسائل تھے، خوراک میں احتیاط، پراٹھا بند، حلوے بند، چاکلیٹ کیک بند، بیکری پوری بند۔ یعنی میں احتیاط کی قید میں تھا، ذرا لاپروائی کی تو کپکپی کے ساتھ بخار اور ناتوانی کی یلغار۔ اسی لیے عادل میرا دھیان رکھتا تھا۔ وہ آڈی اور ایک ڈرائیور جو ہمارے قافلے میں تھے وہ صرف اس لیے تھے کہ اگر میری صحت کے معاملات دگرگوں ہوتے ہیں تو مجھے فوراً لاہور پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ مجھے عادل پر اعتبار تھا۔ جیسے ایک میراثی نے سنا کہ یہ جو غزل ہوتی ہے بہت عمدہ شے ہوتی ہے۔ وہ ایک طوائف کے کوٹھے پر پہنچا اور غزل سنانے کی فرمائش کی۔ وہ نیک دل خاتون غزل سرا ہو گئی۔اس دوران خاتون نے دیکھا کہ وہ حضرت منہ کھولے خراٹے لے رہے ہیں۔تو اُس نے ناراض ہو کر اُسے جگایا اور کہا کہ میں غزل گا رہی ہوں اور آپ سو رہے ہیں۔اس پر میراثی نے کہا تم گاتی رہو مجھے تم پر اعتبار ہے۔ یہ کہہ کر پھر سو گئے۔ کچھ اس طور مجھے بھی عادل پر اعتبار تھا۔

جیسے دنیا یا اپنے ملک کے وہ شہر جو پہچان رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے لیے بے شک اجنبی ہوں لیکن آپ کے ذہن میں ان کے خدوخال اور مکاینت کی پرچھائیاں سی ہوتی ہیں۔ان کی عمارتوں کے نقش قابل ذکر مقامات کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوتا ہے لیکن رحیم یار خاں کیا تھا، کیسا تھا، وہاں کیسے لوگ بستے تھے اور رحیم یار خاں میں ہی کیوں بستے تھے اس کا ہمیں قطعی طور پر کچھ اندازہ نہ تھا۔ ایسے انجانے شہر ہمیشہ آپ کے لیے ایک غیر متوقع سرپرائز ہوتے ہیں۔ اس لیے بھی کہ آپ اپنے لاہوری گھمنڈ میں مبتلا کسی اور شہر کو اور وہ بھی رحیم یار خان ایسے پینڈو نام کے شہر کو شہر ہی نہیں سمجھتے۔ وہ ایک دور پار کا ایک غریب رشتے دار ہوتا ہے جسے اگر آپ دیکھتے ہیں تو حقارت سے دیکھتے ہیں۔

''ہائیں یہاں میکڈونلڈ بھی ہے۔'' کسی نے چونک کر کہا۔

''ارے بہت بڑا کے ایف سی بھی ہے'' کسی اور نے دوہائی دی۔

اور تب ہم ایک ایسے علاقے میں سے گزرنے لگے جس کی رہائش گاہیں عالی شان تھیں۔ گھر اور بنگلے جدید ترین طرز تعمیر کے حامل تھے اور سپر مارکٹس تھیں اور دمکتے سٹور تھے۔ محل نما عمارتوں کی شانداری تھی اور شہر لاہور کی نسبت ستھرا اور شفاف ہوا والا تھا۔ مکینوں کے چہروں پر آسودگی تھی۔ ہمارا لاہوری گھمنڈ منہ کے بل آن گرا۔ ہماری تو لٹیا ہی ڈوب گئی اور جب اگر یہ لٹیا ٹھیک طرح سے نہیں ڈوبی تھی تو جب ہم میں داخل ہوئے جو لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کی ایک اُس سے بڑھ کر ایک شاخ تھی تو اُس کی رہائشی وسعت اور سہولتوں کے معیار کو دیکھ کر یہ لٹیا پوری طرح ڈوب گئی۔ ایسی ڈوبی کہ پھر کبھی نہ اُبھری۔ ایسی آسائش کہ ہم بے چارے گنگ سے ہو گئے۔ ہمارا لاہوری وقار بے حد مجروح ہوا۔ بلکہ ہچکیاں بھرتا دم توڑ گیا۔ عادل نے تقریباً پورا ہوٹل بک کروا رکھا تھا۔ میرے لیے جو وی آئی پی سویٹ مخصوص کی گئی تھی اُس کی وسعت کو دیکھ کر آنکھیں تھک جاتی تھیں۔ جیسے ماسکو کے پتہ نہیں کتنے ستاروں والے ہوٹل میں ہمارے لیے ''صدارتی سویٹ'' کا انتظام ہوا تو میری بیگم کہنے لگی، میزبانوں سے کہو ہمیں کسی نارمل کمرے میں ٹھہرائیں، ہم نے تین غسل خانے درجنوں تولیے اور باتھ روب کیا کرنے ہیں۔ بیڈ روم سے سٹنگ ایریا کی جانب جاؤ تو بندہ چل چل کر تھک جاتا ہے۔ یہاں بھی کسی حد تک ویسی ہی صورت حال تھی۔ صرف ایک فرق تھا وہاں ایک شاہانہ میز کے درمیان میں بہت اعلیٰ گلابی شیمپین کی بوتل برف میں ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ یہ بوتل بوجوہ ان کھلی ہی پڑی رہی۔ بیگم نے کہا کہ ویٹر سے کہو اسے لے جاؤ۔

میں نے کہا رہنے دو میں نے کون سا اس کا کارک اُڑانا ہے۔ پڑی رہے، اسے دیکھ کر فرحت سی ہوتی ہے۔ پڑی رہنے دو۔

غسل خانے میں بھی اہتمام بہت تھے۔ شاور کی دھار کی بجائے چھم چھم بارش برستی تھی۔ قصہ مختصر میں ذہنی اور جسمانی طور پر آسودہ ہو گیا۔ مجھے رحیم یار خان پسند آنے لگا تھا۔

دن دسمبر کے

برلبِ صحرا......

کوسی کوسی نکھی نکھی دھوپ...... جسے اوڑھ کر سو جانے کو جی چاہے۔

ایسی صحرائی دھوپ

اور اُس دھوپ میں چوکڑیاں بھرتے ہوئے ہرن اور ان میں ایک بلیک بک ہرن، جس نے قلانچ بھری تو وہ معلق ہو گیا۔ میری آنکھ میں نقش ہو گیا۔ اُس کی تھوتھنی پر سیاہ اور مٹی رنگ دھبے ہیں۔

اُس کی پچھلی ٹانگیں سیدھی ہیں اور اگلی خم کھاتی ہوئی۔ جیسے وہ اپنے بدن سے آگے نکلتا ہوا۔ جیسے ''شکنتلا'' کا ہرن۔ وہ راجہ کے تیر سے بچنے کے لیے یوں بھاگتا ہوا کہ اُس کا بدن اُس کی سڈول ٹانگوں سے آگے نکلتا دکھائی دے۔

صحرا کی دھوپ میں تصویر ہوتا سیاہ ہرن، بہزاد کی تصویروں میں زندہ ہوتا ہوا، کسی ایرانی قالین پر شکار کے منظر میں نقش، کسی قدیم غار میں پتھروں پر کھودا ہوا۔ کسی ہیر کے جنگل بیلے میں ٹھٹکتا ہوا۔ ایک سیاہ

بلیک بک ہرن۔ میری آنکھ میں محفوظ، ہوا میں معلق، ٹھہرا ہوا۔ اُس کا روپ دھوپ سنہرا، اس کی آنکھوں میں مدھ بھرے پیالے، ایک سیاہ ہرن، ہوا میں معلق معلق۔

وہ ایک بر لب صحرا ایک ڈیرہ تھا جہاں ہم مدعو تھے۔ کہیں اُس لامتناہی چار دیواری کے اندر عربوں کا وہ داستانوی محل تھا جس کی شہرتیں بہت تھیں۔ ہمارے لیے وہ صرف ایک طویل دیوار تھی جس کے سائے سائے ہم صحرا کے قریب ہوتے جاتے تھے۔ محل کی عمارت کا کوئی گنبد کوئی جھروکا دکھائی نہ دیتا تھا اور ہاں ہم اُس دیوار کے سائے سائے تو نہیں اُس کے سائے سے پرے یوں چلے جاتے تھے کہ ایک حفاظتی علاقہ ہمارے درمیان حائل تھا۔ کیا پتہ اُس چار دیواری کے اندر کوئی محل تھا بھی نہیں۔ اُن دیواروں میں گھرا ایک اور صحرا ہو کیا خبر، اور ہمیں کیا اگر اُس کے اندر ایک اور تاج محل پوشیدہ ہو، ہمیں کیا۔

ہم رحیم یار خاں میں اپنی پہلی سویر میں اپنی رہائش گاہ کی آسودگی میں سے نکلے تو سب لوگ باقاعدہ چہچہا رہے تھے۔ پرمسرت پرندے سے ہو گئے تھے۔ عادل اپنا کاؤبوائے ہیٹ درست کرتا کسی افریقی گیم کیپر کی مانند تمام جانوروں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نسیم نے غالباً دو تین مرتبہ شیو کی تھی تا کہ وہ ساٹھ برس کا نہیں، تیس برس کا نرم سا لونڈا لگے اور وہ لگ رہا تھا۔

بخاری جو تکیہ تارڑ کا آفیشل فوٹو گرافر تھا، بھوری مونچھیں سنوارتا اپنے کیمرے کو اتنے غور سے دیکھ رہا تھا جیسے اُس نے اس سے پیشتر کوئی کیمرہ دیکھا نہ ہو۔ یوسف جو شفقت چیمہ سے بہت مشابہت رکھتا تھا، بخاری کے آگے پیچھے ہوتا مسکراتا جاتا تھا تا کہ اُس کی ایک ہیرو نما فوٹو کھنچ جائے۔

صدیق شہزاد جو مار و مار کرتا اپنے گاؤں سے چلا آیا تھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ایک راجپوت رانا بننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ فرید ایک موٹے کبوتر کی مانند گٹک رہا تھا۔ وہ بھی اسلام آباد سے اپنی مینڈکی پر سوار ہم میں شامل ہونے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ خواجہ تنویر ایک مؤدب خاموشی میں تھا کہ بھائی جان صالح خطرناک حد تک اُس کی قربت میں دکھائی دے رہے تھے۔ فہد کو کسی نے سمجھا دیا تھا کہ یہ جو تم بوتھی سجا کر ایک ناکام عاشق کی مانند یونہی پوز بنائے پھرتے ہو تو چغد لگتے ہو۔ چنانچہ اب وہ ہر وقت بے وجہ مسکراتا رہتا تھا۔ ذوقی شاید سوتے ہوئے بھی وہ واہیات رنگوں کی عینک پہنے رکھتا تھا جو اُس نے شاہ عالمی کے کسی فٹ پاتھ سے خریدی تھی۔ وہ ان دنوں مغموم پھرتا تھا کہ بقول اُس کے اس کے ساتھ ایک بڑا حادثہ ہو گیا تھا۔ وہ کسی گروپ کے ساتھ نہایت پرشوق ہو کر کوہ نوردی کے لیے جا رہا تھا کہ اُس میں شامل ایک خاتون پر ذوقی میاں لٹو ہو چکے تھے۔ سفر کے آغاز میں ہی اُس خاتون نے ذوقی کو نہایت پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا ذوقی بھائی! ذرا اس ریڑھی والے سے گنڈیریاں تو لا دیجیے۔ پلیز ذوقی بھائی جان! بس یہی بڑا حادثہ ہو گیا تھا۔ ذوقی نے کوہ نوردی پر لعنت بھیجی اور نہایت رنجیدہ حالت میں واپس آ گیا۔ عثمان اپنی سیاہ داڑھی میں کسی ترک ڈرامے کا جنگجو لگ رہا تھا۔ سیف نہایت متانت سے مدبر بننے کی کوشش کر رہا تھا اور عثمان پیرزادہ نے رحیم یار خان آنے کی خوشی میں ایک نیا سگار سلگا لیا تھا۔ ہمارے ہمراہ عادل کے ایک اور بچپن کے دوست کرنل اختر بھی تھے جو اُس کے دوست کی بجائے برخوردار سے لگتے تھے۔ ظاہر ہے آپا شاہین اپنے رنگ رنگ کے چوغوں، ٹوپیوں، انگوٹھیوں، گہنوں اور دیگر زیبائش میں ملبوس ہماری بزم کی نرالی سی رونق تھیں۔ وہ اہل زبان ہونے کے ناتے ذرا لاتعلق سی ہوئی جاتی تھیں۔ جب کہ اُن کے میاں اشرف صاحب نہ صرف عمدہ حس مزاح رکھتے تھے بلکہ ذرا سی موسیقی سننے پر اُن کی حس حرکت بھی بیدار ہو جاتی تھی۔ ٹھیٹھ پنجابی میں اپنی بیگم کے ساتھ پیار کا اظہار کرتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھار کرتے تھے۔ لوگ کوہ نوردی کرتے ہیں اور عائشہ شجر نوردی میں ایکسپرٹ تھی۔ ہر بلند درخت کو حسرت سے دیکھتی تھی اور موقع ملتے ہی اُس پر چڑھ جاتی تھی۔ اپنا پہلا سگریٹ اکثر وہ کسی درخت کی چوٹی پر پہنچ کر کسی شاخ سے جھولتے ہوئے پیتی تھی۔ ڈارون کے ارتقائی نظریے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا۔

اُس پوشیدہ قصہ کی چار دیواری کے اختتام پر ایک ویرانہ شروع ہو گیا۔ ریت اور جھاڑیاں سویر کی دھوپ میں اور اتنے ڈھیر سارے بھانت بھانت کے جانور اور پرندے زندگی سے خوش، مسرت سے اُلجھتے ہوئے چہکتے جھرنے۔

ہم صحرا کنارے اُس ڈیرے پر پہنچے۔ چھپت پر بچھی چار پائیوں پر ہم بھی دھوپ میں بچھ گئے۔ صحرا کی قربت کو محسوس کیا، اُس کی ریتلی ہوا کی کھنک میں کچھ سانس بھرے، کچھ پھل فروٹ کھائے، چائے سب نے سُر کی۔

عائشہ نہایت مایوسی سے صحرا کو تکتی تھی کہ وہاں کوئی درخت نہ تھا۔ بخاری اور فرید ہانپتے ہوئے اوپر آئے

''سر وہاں ہرن ہیں''

''کہاں..... صحرا میں؟''

''ایک کچی چار دیواری کے اندر ایک چھوٹا سا صحرا ہے وہاں۔''

ہم ایک صحرائی جھکڑوں سے نیم شکستہ ہو چکے دروازے میں داخل ہوئے۔ اُس ڈیرے سے چند ٹیلوں کے فاصلے پر اور واقعی وہاں ایک کچی چار دیواری کے اندر ایک خاصا وسیع ویرانہ گھرا ہوا تھا۔ جیسے کسی قدیم شہر کی کھنڈر ہوتی کچی فصیل ہو۔

CamScanner

اور وہاں ہرن تھے۔ اُن کا ہندو رکھوالا عجیب آوازیں ہوکتا ان کو بھاگنے کے لیے مائل کر رہا تھا اور وہ کبھی کبھار کسی ٹیلے پر چڑھ کر ادرگرد نظر کرتے اور پھر اُتر کر دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگ جاتے۔ وہ ہم سے خاصے فاصلے پر تھے اور یوں قلانچیں بھرتے، ٹیلوں کو پھلانگتے وہ دور سے کسی ایرانی مختصر تصویر کے شکار کے منظر میں مختصر لگتے تھے۔ وہ دیوار کے پہلو میں بھاگنے لگتے۔ پوری رفتار پکڑتے تو چاردیواری کا کونا آ جاتا اور وہ ٹھٹک کر رخ بدل لیتے۔

انہیں زقندیں بھرنے کے لیے ایک پورا صحرا درکار تھا۔ چاردیواری میں گھرا ہوا ایک وسیع رقبہ نہیں۔ اس لیے وہ ٹھٹک جاتے تھے انہیں رُخ بدلنا پڑتا تھا اور اُن میں صرف ایک بلیک بک تھا۔ کالا ہرن تھا، الگ اور پرشکوہ دکھائی دیتا۔ وہ جب زقند بھرتا تو ہوا میں جیسے معلق ہو جاتا۔ میری آنکھوں میں نقش ہو جاتا۔ مہرانوں کے جنگل میں، لال سوہانزا پارک میں بھی ہرن بہت تھے لیکن اُن میں اس نشان والا سیاہ ہرن نہ تھا۔ اگر تھا تو میری آنکھوں میں کیوں نقش نہ ہوا۔

یہ سیاہ ہرن رات کی تاریکی میں تو رات ہو جاتا ہوگا۔ اُسے یوں صحرا کی دھوپ میں قلانچیں بھرتے، ہوا میں معلق ہوتے دیکھ کر میرے سفر کی سب تھکاوٹیں زائل ہوگئیں۔

بوڑھے آوارہ گرد کو قدرت نے ایک اور انعام سے نواز دیا تھا۔ ہوا میں ایک زقند بھرتا معلق ہو چکا بلیک بک ہرن!

اے غزالِ شب تیری پیاس کیسے بجھاؤں میں

روہی کے صحرا میں اک عجب بارات اُتری ہوئی تھی۔ ڈھولکی پر تھاپ پڑتی تھی تو دل پر تھاپ پڑتی تھی۔

گھنگھرو کھنکتے تھے اور ان کی کھنک صحرا کی دھوپ میں جھانجھریں بجاتی تھی۔ ہارمونیم کی صدائیں اس قبرستان پر سریلی روحوں کی مانند رقص کرتی چلی جاتی تھیں۔ پھر سجے سجائے، پھندنوں کی رنگینیوں سے جھولتے اک تار سے اور روہی کے ساز تھے۔ بھیل قبیلے کے قدیمی موسیقار ہمارے بارات کے آگے آگے چلتے گاتے چلے جاتے تھے۔

سچ پوچھیے تو اس بارات کا دولہا عثمان پیرزادہ تھا جو اپنے پیٹ کی بجائے آج سندھی ٹوپی اوڑھ کر چلا آیا تھا۔ پچھلی شام تھی اور ہم باراتیوں میں کئی لوگ تھے جو صحرا کی ریت کے ذروں پر جل ترنگ بجاتی دھوپ کے گلشن میں رنگ رنگ کے سریلی گل کھلاتی اس بھیل موسیقی کی مدھ بھری تانوں پر بے اختیار سر دھنتے تھے اور ہمارے پاؤں رقص پر مائل ہوتے تھے۔ اشرف صاحب باقاعدہ وجد میں تھے۔ ادھر عائشہ بھی سر ہلاتی چلی جاتی تھی اور وہ رنگ رنگیلے البیلے سجیلے بھیل موسیقار روہی کی شان میں قصیدے گا رہے تھے۔

روہی ساڈی دیس ٹھکانہ
میں روہی وِچ رہنداں آں

ریتلے قبرستان کے آغاز میں لال بھیل کی سفید قبر دھوپ میں لشکتی تھی۔ ہم نہ اُس کے لیے فاتحہ پڑھ سکتے تھے اور نہ ہمیں موت کے منتر یاد تھے تو ہم کیا کرتے۔ ہم نے سوچا ہم وہی کریں گے جو اُس کے قبیلے کے لوگ کریں گے۔ پر انہوں نے اپنے گورو کے لیے نہ تو پانچ منٹ کی خاموشی اختیار کی اور نہ ہی اُس کی روح کے چھٹکارے کے لیے کوئی دعا دارو کیا بلکہ وہ اُس طور گاتے بجاتے اُس کی مستطیل قبر کے سفید تھڑے پر چڑھ گئے اور ناچنے لگے۔ ہمیں ان کے سوگ کا یہ انداز پسند آیا۔ یقیناً آنجہانی لال بھیل بھی خوش ہوا ہوگا کہ میرے قبیلے کے لوگ میری قبر پر دھم دھم ناچ رہے ہیں۔

قبر پر رقص کرنے والا کوئی بھیل یک دم ساز بجانا موقوف کر دیتا اور اپنے رنگین لبادے کے ساتھ قونیہ کے کسی درویش کی مانند گھومنے لگتا۔ اس کے ساتھی موسیقار دُھن کو تیز کرتے اور لے کو بلند کرتے چلے جاتے اور اس کا پھولوں بھرا سرخ لبادہ بھی گھوم چرخوا گھوم، گھومتا جاتا۔ یہ قونیہ کے نہیں روہی کے درویش تھے۔ ان صحرائی خطوں کے موسیقار اپنے سازوں کو دُلہن کی مانند سجاتے ہیں۔

ایک ساز...... ایک اونٹ...... ایک دُلہن

آپ کو کھیمسو خان کا جھالروں والا الغوزہ یاد ہوگا۔ الن فقیر کا اکتارہ بھی فراموش نہ ہوا ہوگا۔ مجھے تھر کا وہ اندھا گلوکار کہاں بھولے گا جس نے اپنے ساز کو مور کے پروں اور رنگین لڑیوں سے بھی رکھا تھا۔ اس لیے کہ اُن کا ساز اُن کا ہمدم ہے، ساتھی اور رفیق ہے۔ وہ بلوچ جو تنہا ویرانے میں چلا جاتا تھا اور پوچھنے پر کہتا ہے کہ میں تنہا تو نہیں ہوں، میرا ساز میرے ساتھ ہے۔

آپ کو چنن پیر کے میلے کے سجے ہوئے اونٹ بھی یاد ہوں گے۔ ساربان خود بھوکا مر جائے لیکن اپنے اُونٹ کی سج دھج میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ اُس کے بدن پر خوش نظر گل بوٹے بنوائے گا۔ اگر یہ لوگ ایک ساز اور ایک اونٹ کو رنگین پھندنوں اور جھالروں کو سجاتے ہیں تو اپنے رخشِ تصور کو ذرا ڈھیل دیجیے کہ ان کی دُلہن کیسے کیسے سجتی ہوگی۔ میں حسب عادت چپ چاپ ان سے الگ ہوا۔ انہیں اپنے گورو کی قبر پر ناچنے دیا اور قبرستان کی تنہائی میں چلا گیا۔ قبروں کی ساخت عجیب سی تھی۔ سفید قبروں پر اونٹ کے کوہان کی مانند کچھ اُبھار سے تعمیر کیے گئے تھے جن میں کسے کچھ ایک تکون کی مانند تھے۔ جانے کیا تھے۔ شاید کوئی قدیم ہندو نشانیاں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ہندوؤں میں بھیل کمتر ذات گردانے جاتے ہیں۔ شاید شودھروں کے آس پاس چنانچہ یہ نشان بھی اُن کی ذات کے کوئی مذہبی نشان تھے۔

CamScanner

ایک حیرت تو یہ بھی تھی کہ ہندو عقیدے کے مطابق مردے کو چتا میں جلایا نہ جائے اور اُس کی کھوپڑی نزدیک ترین عزیز پاش پاش نہ کرے تو اُسے نروان حاصل نہیں ہوتا۔ جیسے ہم دفنائے جاتے ہیں اور پچھلے دنوں جب کووِڈ کی وجہ سے شاید جاپان میں چند مسلمانوں کی لاشوں کو جلایا گیا تو اس پر شدید احتجاج ہوا۔ یہاں پاکستان میں بھی چند مقامات پر ہندو برادری نے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے شمشان گھاٹ کے لیے جگہ الاٹ کی جائے۔ وہ مجبوراً اپنے مردے دفناتے تھے۔ وہ انہیں جلانا چاہتے تھے لیکن یہاں بھیل بخوشی اپنے مردے دفن کرتے ہیں اس میں کیا راز ہے میں نہیں جان سکا۔ البتہ میں نے ایک بھیل کو الگ لے جا کر پوچھا تو وہ کہنے لگا ہمارے ہاں مختلف رواج ہیں۔ ہم اپنے مردوں کو دفن بھی کرتے ہیں، جنگل میں چھوڑ کر بھی آ سکتے ہیں اور دریا برد بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یعنی نہ کبھی جنازہ اُٹھتا اور نہ کوئی مزار ہوتا۔ غرق دریا ہونے میں بھی بہت سہولتیں ہیں۔

میرا خیال ہے لال بھیل نے بالآخر تنگ آ کر اپنے مریدوں سے درخواست کی ہوگی کہ اب میری قبر پر ناچنا بند کرو، بہت ہو چکی۔ مجھے ابد تک آرام کرنے دو۔ چنانچہ سب ساز سب گیت سب دُھنیں موقوف ہوئیں اور قبرستان کے باسی پھر سے خوابیدہ ہو گئے۔ لال بھیل نے اطمینان کا سانس لیا اور کروٹ بدل کر ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

برابر کی قبر میں سرودی بائی زوجہ والی جی بھی سو گئی اور ذرا پرے راول بھی ولد گنیش جی نے ایشور کا شکر ادا کیا اور پھر سے خراٹے لینے لگے۔

روہی ساڈا دیس ٹھکانا
میں روہی وچ رہناں آں

اب ہمارے رُخ زیادہ تر نیا پتن مینار کی جانب ہو گئے اور ظاہر ہے ہماری گاڑیوں کے رُخ آہن بھی اُدھر کو ہو گئے۔

میں نے اس تاریخی یادگار کے بارے میں سن تو رکھا تھا لیکن یہ کہاں ہے، کدھر ہے، اس کے بارے میں بے خبر تھا۔

جیسے ایودھیا کا شہر بابا فرید شکر گنج کے ورود سے پاک پتن ہو گیا کہ یہ ایک دریا کنارے آباد تھا، اسی طور یہ پتن مینار بھی تو لب دریا ہوگا۔ ورنہ پتن کیوں کہلاتا۔ اگر یہ بات ہے تو چل کے اُس دریا کو دیکھتے ہیں۔

میرے اس رحیم یار خانی بیانئے سے یہ مت اخذ کیجیے کہ یہ تارڑ منڈلی صرف موج میلہ کرنے گئی تھی۔ ہم وہاں کے زرعی اور تعمیراتی معاملات کا مشاہدہ بھی کرتے چلے جاتے تھے۔ مثلاً جہاں کہیں کماد یا گنے کی فصل نظر آتی عادل فوراً لیکچر جھاڑنے لگتا کہ یہ کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ علاقہ جو پاکستان کی بہترین کپاس پیدا کرتا تھا اب شوگر مافیا کی سازشوں سے صرف گنے کی فصل اُگانے لگا ہے اور یاد رکھئے کہ بیشتر شوگر ملیں شریفوں اور زرداریوں کی ملکیت ہیں۔ ان میں ایک آدھ ترین بھی شامل کر لیجیے۔ میں نے بصد ادب استفسار کیا کہ کیا مقامی کاشت کار بے وقوف ہیں جو شوگر مافیا کی سازشوں کا شکار ہو گئے ہیں، وہ بھلے کپاس کاشت کرتے رہیں، انھیں کوئی روکتا تو نہیں۔

''جی تارڑ صاحب آپ مہمان لکھاری وغیرہ تو ہوں گے مگر میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایگری کلچرل یونیورسٹی لائلپور کا فارغ التحصیل ہوں اس لیے میں ان معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ کپاس کی فصل مشکل ہوتی ہے جب کہ گنا کاشت کر دینا آسان ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ محنت نہیں لگتی اس لیے زیادہ لوگ اس جانب مائل ہو گئے ہیں۔ پھر ان کو نقد رقم بھی ادا ہو جاتی ہے۔''

''ویسے میری معلومات کے مطابق گنا دیگر فصلوں کی نسبت ایک مشقت آمیز فصل ہے۔ ہمارے ہاں محاورہ ہے کہ ساون بھادوں میں گنے کے کھیت میں گوڈی کرنے والا کسان فقیر ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی کٹائی کے بعد اس کی جڑیں زمین سے اُکھاڑنا ایک نہایت محنت طلب عمل ہے۔ کپاس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''تارڑ صاحب بے شک ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں لیکن میرا پاؤں نہیں ہوگا کہ میں زرعی یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہوں۔ گنے کی کاشت نے ہماری کاٹن انڈسٹری کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تصور کیجیے ہم ان دنوں کپاس درآمد کر رہے ہیں یہ سب شوگر مافیا کی کارستانی ہے۔

ہم اس زرعی یونیورسٹی سے بے حد عاجز آئے ہوئے تھے۔ عادل نہ صرف کھیتی باڑی اور فصلوں کے رموز سے آشنا تھا بلکہ فوڈ ٹیکنالوجی کے بارے میں بھی بے تکان بولتا تھا۔ ڈبے کے دودھ میں کتنے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ آئس کریم میں کن چیزوں کی آمیزش ہوتی ہے یا پھر چقندر میں کون کون سے وٹامن رینگتے پھرتے ہیں۔ اس کپاس قضیئے کے علاوہ ایک بہت حیرت بھری تعمیراتی حقیقت بھی آشکار ہوئی۔ سفر کے دوران اور پھر اس شہر کے نواح میں کئی باغوں، کھیتوں، رہائش گاہوں اور قبرستانوں کے گرد کچی دیواریں تھیں جن کی نشاندہی اُس نے اور بعد ازاں بھٹو نے کی۔ ''یہ سب دیواریں پٹھان معماروں کے معجزۂ فن کی دلیل ہیں۔ وہ گاؤں گاؤں پھرتے اور لوگ ان کی آمد کے منتظر ہوتے۔ وہ کچی دیواریں تعمیر کرنے کے ماہر تھے۔ اُن کے پاس سوائے ایک کدال کے اور کچھ نہ ہوتا۔ وہ اُس کدال سے مٹی کھودتے، اُس کا گارا بناتے اور پھر اُس گارے کو تھپک تھپک کر ایک مستطیل شکل دیتے اور ان مٹی کے تھوبڑوں کو تہہ در تہہ جما کر دیوار بلند کرتے جاتے۔ شام اُترنے سے پیشتر وہ ایک چار دیواری کھڑی کر دیتے۔ ان کی تکنیک کو مقامی لوگوں نے برتنے کی

کوشش تو کی پر ناکامی ہوئی۔ مٹی میں کتنا پانی ملانا ہے، اسے کتنا کوٹنا اور تھپکنا ہے اور کیسے وہ گارے کے بلاک ایک دوسرے پر جماتے ہوئے دیوار تعمیر کرتا ہے صرف وہی اس فن کے ماہر تھے۔ ان دیواروں پر موسم کم اثر انداز ہوتا تھا۔ بارشوں کو بھی سہہ جاتی تھیں جبکہ مقامی لوگوں کی بنائی ہوئی دیواریں پانیوں کی بوچھاڑ میں ڈھے جاتی تھیں۔"

اور یوں ہم سب حیرت انگیز دیواروں کی پہچان کرنے لگے۔ ان میں سے کئی پچاس ساٹھ برس پرانی تھیں، اُن میں ایک خاص شکل کی دراڑیں تھیں لیکن وہ قائم تھیں۔ وہ مقامی دیواروں سے بالکل الگ دکھائی دیتی تھیں۔

ان دیواروں کی کہانی میں بھی جانتا تھا۔

میرے ابا جی مجھے بتایا کرتے تھے اور تب میں بھی چھوٹا تھا کہ میرے بچپن میں ہمارے علاقے میں دیواریں بنانے والے پٹھان کاریگر آیا کرتے تھے۔ تمہارے دادا جان نے ان سے مویشیوں کے باڑے کے گرد ایک دیوار بنوائی تھی جو بہت مضبوط تھی۔ میں نے ان سے پوچھا آپ لوگ کہاں سے آئے ہو تو وہ کہنے لگا ہم غزنی افغانستان سے آئے ہیں اور ہم بھی تارڑ ہیں تو میں نے یقین نہ کیا اور کہا وہاں غزنی میں تارڑ کہاں سے آ گئے۔ آپ تو پٹھان ہو تو ان میں سے ایک ہنس کر بولا کہ اگر تم لوگ اُدھر غزنی جاؤ اور کہو کہ ہم تارڑ ہیں تو ہم بھی نہیں مانیں گے۔ یہ کم از کم ایک سو برس پرانا قصہ ہے۔ بعد ازاں بہت برسوں بعد یونیسف کے کسی سیمینار کے سلسلے میں کوئٹہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک شب سیرینا ہوٹل میں کچھ مقامی پٹھان ٹرانسپورٹر مجھے ملنے کے لیے آئے۔ وہ میرے پڑھنے والے تو تھے ہی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ ہم بھی تارڑ ہیں لیکن ہم تارن کہلاتے ہیں کہ ہمارے ہاں "ڑ" مستعمل نہیں ہے۔ انسان رزق روزگار کی تلاش میں کبھی کسی دشمنی سے فرار ہو کر اور کبھی کسی جبر کا شکار ہو کر کیسے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر در بدر ہوتا ہے۔ کیا پتہ ہو تارڑ کہاں کے ہیں، کون سی سرزمین سے آئے ہیں۔ عجیب معمہ ہے۔ ویسے ایک اور محقق کی کتاب "پاکستان کی قومیتیں" کی ورق گردانی کیجیے تو ذات پات اور تفاخر کے سب پول کھل جاتے ہیں۔ کسی ایک مقام پر کوئی بھی تا دیر نہیں رہا۔ رام پور میں پٹھان آباد ہیں، بنگال میں کشمیری خانوادے ہیں، ادھر لاہور میں ایرانی حضرات گھر بنائے بیٹھے ہیں اور اب افغانوں کا غلبہ ہے اور تو اور ایتھوپیا اور آسام میں سیاہ فام یہودی نکل آئے ہیں۔

ویسے میرے ابا جی یہ بھی کہا کرتے تھے کہ دو قوموں میں عزت نفس بہت ہوتی ہے ایک پٹھان اور دوسرے سکھ کہ ان میں فقیر نہیں ہوتے۔ پٹھان سے مراد پشتون ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے کہ پٹھان جفاکشی میں بے مثال ہیں۔ وہ سب پُر مشقت پیشے جن سے لوگ اجتناب کرتے ہیں پٹھان ان کو اختیار کرتے ہیں۔ لکڑیوں کے ٹال، بھٹے بھوننا، روڑی کوٹنا، بوٹ پالش کرنا، چوکیداری کرنا وغیرہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قریب کئی برسوں سے پٹھان خاندان عارضی طور پر آتے ہیں اور لکڑی سے کوئلہ بنانے کا اذیت ناک کام کرتے ہیں۔ کویت میں تیل کی دریافت کے بعد جب صحرا میں پائپ لائن بچھانے کا آغاز ہوا تو وہاں کھلے صحرا میں درجہ حرارت 125 سے تجاوز کرتا ہوا اور اُس کڑی گرمی میں ویلڈنگ کرنا لوہے کے پائپوں کی، بیشتر قومیتوں کے مزدور جاں بحق ہو گئے۔ پٹھان اس جہنم کو سہہ گئے اور پائپ لائن بچھا دی۔

میں اپنی عادت کے مطابق صبح سویرے پارک میں سیر کرنے کے لیے جاتا تھا تو سڑک کنارے کبھی کبھار سات آٹھ پٹھان لڑکے کاندھوں پر بوٹ پالش کی صندوقچیاں ڈالے ہنسی مذاق کرتے اپنے اپنے کاروبار کی طرف جا رہے ہوتے، وہ سب بہت خوش شکل تھے۔ ایک روز میں نے ان کے قریب کار روکی اور دو سو روپے ان کی جانب بڑھا کر کہا، یہ تم لوگوں کے ناشتے کے لیے ہے تو انہوں نے رقم لینے سے انکار کر دیا اور ان کے چہروں پر ناگواری تھی کہ ہم فقیر تو نہیں۔ تب میں نے ایک نوعیت کی درخواست کی کہ میں بھیک تو نہیں دے رہا، تم میرے بچوں کی مانند ہو، رزق حلال کماتے ہو تو اچھے لگتے ہو۔ بزرگوں کو انکار نہیں کیا کرتے۔ تب جا کر انہوں نے وہ رقم قبول کی۔

بات پٹھانوں کی بنائی ہوئی کچی دیواروں سے چلی اور پھر ایک داستان ہو گئی۔ لیکن کیا کیا جائے، میں دنیا کی کارواں سرائے میں داستانیں سنانے ہی تو آیا ہوں، سن لیجیے کہ ہم نے بالآخر سو جانا ہے داستاں کہتے کہتے۔ تو سن لیجیے!

پتن مینارہ دور سے نظر آنے لگا۔ ہم درختوں کے ایک جھنڈ میں سے گزر کر جب اس کے سامنے آئے تو وہ اور بلند ہو گیا۔ ایک اونچی شان والی عمارت، زمانے اور موسموں کے ہاتھوں مجبور، اُن کی اثر اندازی اسے کھنڈر کرنے کو تھی۔

لیکن پتن کون سے دریا کنارے تھا۔ وہاں تو آس پاس چند ٹیلے اور حد نظر تک ہریالی بھرے کھیت تھے۔ دریا نہ تھا۔

یہ تو کہاں ممکن کہ ساحل ہو تو ہو سمندر نہ ہو۔
آنکھ ہو اور تماشا نہ ہو
لب لرزاں تو ہوں بوسے کی نمی نہ ہو
وصال ہو اور چادر پر سلوٹیں نہ ہوں
ہجر ہو تیر نیم کش کی خلش نہ ہو
اور پتن ہو دریا نہ ہو
دریا تو تھا جو سرسوتی کی مانند خشک ہو گیا

بھیل موسیقار ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے اور اپنے سازوں اور آوازوں کی لے پر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے کہ یہ پتن مینارا ان کا تھا، وہ اس سرزمین کے وارث تھے۔

ہم مینار تک جانے والی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ وہ آس پاس کے منظر میں سے جدا ہو کر ایک بلند ٹیلے پر بلند ہو رہا تھا۔

اس کے طرزِ تعمیر میں اک دل کشی تھی۔ اس کی بناوٹ میں قدامت کے آثار تھے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اسے بحال کیا گیا ہے۔ اس کی کچھ سجاوٹیں ملوث کے قدیم مندروں سے مشابہ تھیں۔ اسے مستطیل شکل کا کہا جا سکتا تھا۔ یہ کسی عبادت گاہ کا حصہ دکھائی دیتا تھا کہ اس کی دیواروں میں شکستہ ہو چکے گنبدوں کی گولائی کے آثار تھے۔

بھیل موسیقاروں کے ہمراہ ان کے ایک راہنما پنڈت سکھ دیو جی بھی چلے آئے تھے تا کہ وہ ہمیں تین مینارہ کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر سکیں۔ موسیقی موقوف ہوئی، گیروے رنگ کی پگڑی اور کُرتے میں ملبوس سکھ دیو جی ہم سے مخاطب ہو گئے۔

"بھیل قبیلے سے میرا تعلق ہے۔ یہاں کے قدیمی باشندے نہ تو ہجرت کر کے آئے ہیں، یہیں کے رہنے والے ہیں۔ کہیں اور سے نہیں آئے۔"

پنڈت جی کا طنز بہت پوشیدہ تھا کہ آپ یہاں کے نہیں ہیں، جانے کہاں کہاں سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں جب کہ ہم مُڈھ قدیم سے یہاں ہیں اور یہ جس جگہ پہ ہم کھڑے ہیں یہ پتن مینار ہے جہاں ہم کھڑے ہیں۔ یہ ہاکڑا کی تہذیب ہے۔ یہ آپ کو پیچھے نظر آئے گا۔ یہ ہاکڑا دریا ہوا کرتا تھا اور یہ مشرق کی طرف گھاگھرا دریا تھا۔ یہ ہاکڑا تہذیب جو ہے آج سے پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ اس کی یہ عمارت بنی ہوئی ہے پتن مینار۔ پتن کہتے ہیں دریا کو کراس کرنا اور مینار ایک قسم کی روشنی ہوتی تھی۔ یہاں سے لوگ ایران، عراق، راجستھان سے آتے تھے۔ یہاں رات رہتے تھے، اپنا بیوپار کرتے تھے۔ یہ ادھر جو ٹیلہ ہے بہت پرانا ہے اس میں آثار قدیمہ والوں نے بہت کھوج کی ہے۔ یہاں ایک شو مندر بھی تھا۔ یہ ٹیلہ ایک بہت پرانا شہر تھا اور پھول وڈر کے نام سے مشہور تھا اور لوگ یہاں رہتے تھے۔"

یہ کیا ہوا...... پنڈت سکھ دیو جی یہ کون سی کہانی سنا رہے ہیں۔

یہ کہانی تو سنی ہوئی لگتی ہے۔ اپنی سی لگتی ہے۔ کہانی سنائی جا چکی ہے۔ یہ ہاکڑا تہذیب ہے جو پانچ ہزار برس قدیم ہے۔ "بہاؤ" کے زمانوں کی کہانی ہے۔ دریا سوکھ چکے ہیں۔ یہ بھیل ان کے ناک نقشے دراوڑی نسل کا تسلسل دکھائی دیتے ہیں۔ کیا یہ ان کی آل اولاد میں سے ہیں۔ جنہوں نے پانچ ہزار برس پیشتر سوکھتی ندی سرسوتی کے کنارے اُجڑتی ہوئی ایک بستی کو چھوڑا تھا۔ پنڈت کہتا ہے ناں کہ ہم لوگ کہیں سے نہیں آئے، یہیں کے ہیں۔ ان بھیل موسیقاروں میں دریں بھی ہو سکتا ہے۔ سومرو بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ ڈورگا کون سا ہے۔ مامن ماسا تو جنگل میں ایک شاخ سے لپٹا سوکھ چکا ہوگا، سرسوتی سوکھی تو جنگل بھی سوکھ گیا ہوگا۔

لیکن پاروشنی کہاں ہے وہ۔

میں بھیلوں کی بھیڑ سے الگ ہو کر پتن مینار کے گرد جو حفاظتی گیلری تھی اُدھر چلا گیا۔ ہمارے گروپ کے لوگ پنڈت کے گرد کھڑے اُس سے مزید تاریخی حقائق پوچھ رہے تھے۔

پتن مینار ایک بلند سطح پر ایک لائٹ ہاؤس کی مانند کھڑا تھا اور میں اس کی گیلری کے ساتھ لگ کر نشیب میں پھیلے ہوئے منظر کو تکتا جاتا تھا۔ وہ ٹیلا جسے آثار قدیمہ والوں نے کھودا تھا اور بقول پنڈت وہاں ایک بہت پرانا شہر مدفون تھا جسے "پھول وڈا" کہا جاتا تھا۔ تو کہیں یہ وہی بستی تو نہیں جو دریا کے پانی سوکھ جانے سے کھنڈر ہو گئی۔ شاید انہیں پکّی کے الیکے ہوئے کسی گھڑے کی ٹھیکریاں بھی ملی ہوں۔

اس ٹیلے کے قریب ایک کچا گھر دکھائی دے رہا تھا جس کے صحن میں ایک عورت سرخ چادر کا گھونگھٹ نکالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کے بازوؤں میں کہنیوں تک سفید کنگن تھے۔ کیا پتہ یا پاروشنی ہو، اس کی مٹھی میں کنک کے چند دانے ہوں اور اُس کے اندر درچن کا بیج ٹھہرا ہوا ہو اور اُس نے اپنی بستی کو چھوڑا نہ تھا۔ وہ وہاں کچے صحن میں سر جھکائے اُس ٹیلے میں دفن اپنی بستی کو پھر سے آباد کرنے کی آرزو میں انتظار کر رہی تھی۔ ان موسموں کا جب وہ کنک کے مٹھی بھر دانوں کو دھرتی ماں کی کوکھ میں بو دے گی اور اُس کی کوکھ میں سے درچن کی نسل کا بوٹا پھوٹے گا اور بستی پھر سے آباد ہو جائے گی۔

سرسوتی میں پھر سے پانی اُتر آئیں گے۔

کچے صحن میں سر جھکائے بیٹھی پاروشنی پانچ ہزار برس سے انتظار کر رہی تھی۔

بھونگ کی مسجد ایک ایسا عجوبہ تھا جو عجائب کی سرحدوں سے بھی آگے تھا۔ یہ مسجد ایک سحر تھی جو ہر دیکھنے والی آنکھ میں فنِ تعمیر اور زیبائشوں کا آرائشوں، فطائیوں، گل بوٹوں کا اور حیرانیوں کا جادو بھر دیتی تھی۔ یہ انسانی کاریگری، ہنرمندی اور عقیدت کے جذبوں کی معراج تھی۔ یہ کمالِ فن کا ایک معجزہ تھی۔

ہر ایک حیرت سرائے تھی۔

اس سرائے میں داخل ہونے والا ہر مسافر اس کے حسن کے جادو کا اسیر ہو کر دم بخود، اپنے قدموں پر حنوط کھڑا رہ جاتا تھا کہ یاالٰہی یہ میں حسن جمال کی کس گرفت میں آ کر پتھر ہوتا جاتا ہوں۔ مجھ پر کون سے حسن بلاخیز کا اثر ہوتا جاتا ہے۔ یہ کوئی سراب ہے یا خوابوں کا کوئی قدیم قصر۔ میری آنکھوں کے پرندے بے تاب ہو کر اگر چھت کی صناعی اور شیشوں کی بناوٹ کی دمک تک جاتے ہیں تو وہیں ٹھہر جاتے ہیں۔ اگر خطاطی کے معجزوں کا ورد کرتے ہیں تو وجد میں آ جاتے ہیں۔ سمندر کی سیپیوں سے تراشے ہوئے گل بوٹوں میں آشیانہ بناتے ہیں تو وہاں سے واپسی کا نام نہیں لیتے، وہ انہیں کسی گلشن میں کھلے پھول بوٹوں کی مانند مہک آور سمجھ لیتے ہیں۔

نظر جدھر جاتی ہے اُدھر سے واپس نہیں آتی۔

بھونگ کی مسجد کا کوئی مخصوص طرز تعمیر نہیں ہے۔ مقامی کاریگروں کی ہنر مندی اور ان کے ذوق جمال کا ایک مجموعہ ہے۔

رئیس غازی نے اس عجوبہ مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا۔ ان کے پیش نظر کوئی مخصوص طرز تعمیر نہ تھا۔ انہوں نے اس کی بنیاد رکھ دی اور بنیاد میں اینٹ روڑے کی بجائے حسن کے شرارے بھر دیے۔ عشق کے چراغ رکھ دیے۔

وہاں چراغ عشق دا تے کردے روشن سینہ
دل دے دیوے دی رُشنائی جاوے وچ زیناں
(میاں محمد بخش)

اور عشق منصوبہ بند نہیں ہوتا۔ اس لیے اس مسجد کا کوئی طرز تعمیر نہیں ہے۔ قدرت میں بھی ترتیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس مسجد میں بھی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ رئیس غازی بھی عشق الٰہی اور عشق رسولؐ میں مبتلا تھے اور عشق منصوبہ بند نہیں ہوتا۔

کسی دور افتادہ گاؤں میں اگر ایک ایسا معمار ہے جس کا فن پوشیدہ ہے تو آئے اور اس مسجد کے در و بام میں ظاہر کر دے۔ جہاں بھی چاہے اپنی انگلیوں میں چھپے تخلیقی معجزے کا اظہار کر دے۔ کوئی نقاش ہے جس کی زمانے نے قدر نہیں کی تو وہ چلا آئے اور اس کے اندر جو نقش قدرت نے ثبت کیے ہیں انہیں اس عمارت کے کسی گوشے میں منتقل کر دے۔ جسے ناز ہے کہ وہ پتھر تراش کر اُن میں سے لالہ گل کی صورتیں ظاہر کرنے پر قادر ہے تو وہ بھی آ جائے اور اس عمارت کو گل و گلزار ایسا کر دے کہ اُسے دیکھ کر پرندے بھی دھوکا کھا جائیں اور اُس گلزار میں اُترنے کی سعی کریں۔

یوں جانئے یہ مسجد آرائشی فنون اور خطاطی کے حسن کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس سرزمین کے بے مثال ہنر مندوں کے ہاتھوں کے معجزوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ایک داستانوی روایت بھی ہم نے سنی تھی کہ جب تک رئیس غازی اس مسجد کی تزئین و آرائش کرتے رہیں گے، اسے تعمیر کرتے رہیں گے، موت ان کے قریب نہیں آئے گی، لیکن موت کہاں ٹھہرتی ہے۔ جب آنا ہو تو ایک لمحہ کا توقف نہیں کرتی، آ جاتی ہے۔

بھونگ کی مسجد کی آرائش آج بھی جاری ہے۔ رئیس کی آل اولاد نے اس مسجد کی زیبائش کو وراثت میں پایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کی چھت پر کچھ کاریگر گل بوٹے تخلیق کرنے میں مشغول تھے۔ ایک مقام پر فرش کے سنگ مرمر کے چوکھٹوں کو تبدیل کیا جا رہا تھا۔

• ایسا تو نہیں ہوتا تھا کہ ہم رحیم یار خاں آئیں اور بھونگ تک نہ چلے آئیں۔ تو ہم چلے آئے تھے۔

وہاں رئیس خاندان کی زمینوں اور اس مسجد کے انچارج میر منشی ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ایک دل نشیں وسیع ہال میں ہمارے لیے خوراک کے بھی وسیع بندوبست کر رکھے تھے۔ مہمان خانہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ پر ہم تو گھڑی دو گھڑی کے مسافر تھے۔ شب بھر کہاں ٹھہرنے والے تھے۔ ہم تو بے چین تھے اُس مسجد کو دیکھنے کے لیے جو ایماں کی حرارت رکھنے والوں نے شب بھر میں نہیں بنائی تھی۔

بھونگ مسجد کی مرکزی محراب کی چکا چوند اور صناعی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ البتہ اس کے طرز تعمیر میں ایک گوردوارے کی بناوٹوں کا شائبہ ہے اس لیے کہ یہ اس سرزمین کے تعمیراتی حسن کی دل کشی کی علامت ہے۔ آپ بادشاہی مسجد کے پہلو میں واقع رنجیت سنگھ کی سمادھی اور گوردوارے کے گنبد دیکھیے، دور سے یہ ایک ہی عمارت کا تسلسل دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے صرف برصغیر کی مساجد کے گنبدوں پر آپ کو کلس نما سجاوٹ دکھائی دے گی جو مقامی ثقافت کا تسلسل ہے۔ یہ کلس کسی مندر کے بھی ہو سکتے ہیں لیکن دراصل یہ کسی بدھ سٹوپا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جیسے ایک سٹوپا کی سات گول چھتریاں ہوتی ہیں جن کا گھیر کم ہوتا جاتا ہے۔

یوں یہ جو اکثر قدیم مساجد پر کلس نما آرائش دکھائی دیتی ہے اس کے بھی سات سنہری گھیرے ہوتے ہیں۔ چین کی مساجد ہمیشہ پگوڈا نما ہوں گی کہ یہی طرز تعمیر ان موسموں کے لیے موزوں ہے۔ چنانچہ بھونگ کی مسجد کا مرکزی حصہ کسی گوردوارے یا مندر سے مشابہ دکھائی دیتا ہے تو یہ روایت کا تسلسل ہے اور یوں بھی عشق مذہب کی قید سے ماورا ہوتا ہے اور یہ مسجد بھی عشق کے جذب میں ڈوب کر تعمیر ہوتی چلی گئی۔

میں اب زمین پر بیٹھنے جوگا نہیں رہا۔ بمشکل کسی سہارے بیٹھ جاؤں تو پھر اُٹھا نہیں جاتا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ بیٹھے ہیں رہگذر پر ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں۔ کوئی اُٹھائے گا تب ہی اُٹھیں گے۔ البتہ اس جہان سے اُٹھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اُس کے اُٹھانے سے اٹھ جائیں گے۔ چنانچہ ایک کرسی پر اُس نظروں کو اپنے حسن سے خیرہ کر دینے والی محراب کے سامنے بیٹھے اور دو نفل شکرانے کے ادا کیے۔

رُخصت ہونے سے پیشتر اُس چھت پر ایک نظر ڈالی جو شیشہ گری کے جلووں سے دمکتی تھی۔ ایک شیش محل تھا جو آسمانوں سے نازل ہو رہا تھا اور وہ ہزاروں شیشے آئینے ہو رہے تھے اور ان سب میں ایک سفید بالوں والے بوڑھے کا عمر رسیدہ چہرہ تھا جس پر حیرت کی تتلیاں اُترتی تھیں۔

رُباعی

یہ حُسن پرستی جو ہے، تُو ہی تُو ہے
ہاں رنگ ہی رنگ ہے تو بُو ہی بُو ہے
آئینے ہی آئینے ہیں میرے دل میں
اور کون ہے آئینوں میں؟ تو ہی تو ہے

فقیر صادقین
۳۱ مئی ۷۴ء

مستنصر حسین تارڑ کے لیے
سب ویسے شیشے دا مندر وچ شاہ حسین نماناں
(شاہ حسین)

''میں احمد ہمیش ہوں''

ڈاکٹر یونس جاوید/لاہور

دور سے دیکھو تو ساتویں جماعت کا لڑکا سا۔ قریب سے دیکھا، سنا تو پورا پہاڑ۔ بات چیت کے قرینے...... اور سلیقے سے پورا ''کے ٹو'' کیا لہجہ تھا، کتنی گھرج تھی آواز میں۔ نام بھی الگ سا احمد ہمیش (بعد میں اس نے بتایا تھا کہ پہلے اس کا نام احمد بزمی تھا)

اس نے ایک اجنبی کے طور پر حلقہ ارباب ذوق میں تنقید میں حصہ لیا۔ چند جملے ہی ادا کیے تھے کہ لب و لہجے اور الفاظ کے جماؤ اور ادائیگی کا قرینہ بے مثال، سب متوجہ ہو گئے۔ جوائنٹ سیکرٹری نے پوچھا ''آپ کا اسم گرامی؟'' جواب ملا ''احمد ہمیش''۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاک ٹی ہاؤس زندہ و تابندہ تھا کہ مشاہیر سلامت تھے۔ شکیب جلالی سے ناصر کاظمی تک اور عزیز الحق سے صفدر میر تک۔ کیا بہار تھی...... کیا جوبن تھا پاک ٹی ہاؤس کا۔ ٹی ہاؤس کی فضیلت ہی یہ تھی کہ کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا، بھولا بھٹکا مسافر، کوئی نام نہ تعارف، نہ جان پہچان نہ دوستی۔ اگر وہ لفظوں کا شناور ہوا تو ایک دن میں سبھی مراحل طے ہو گئے۔ سب سے پہلے ٹی ہاؤس خود گلے سے لگاتا اور اپنے اندر جذب کر لیتا۔ اور نئے آنے والوں کو، پروانوں سے شیر و شکر کر دیتا کہ واپسی کا راستہ بند اور داخل ہونے کے لیے سو در کھل جاتے۔ جس طرح صادق مدہوش...... جب وہ پہلی مرتبہ گرجدار آواز میں تنقیدی بنوٹ لیے میدان میں اُترا تب گھنٹے بھر میں قبول کر لیا گیا۔ مگر بہت دنوں بعد جس دن سراج منیر نے حلقۂ ارباب ذوق (ادبی) میں زبان کھولی...... سب گردنیں موڑ موڑ کر تکنے لگے کہ نفاست اور علمیت سے بھری یہ آواز کس کی ہے؟ کم لفظوں میں دریا کا بہاؤ تھا، دلائل اور حوالوں کے ساتھ۔ بلا کا اعتماد کہ ہر لفظ حرفِ آخر تھا۔ تب بھی کئی ایک نے ناک بھوں چڑھائی مگر میرا جی چاہتا تھا کہ وہی وہ بولے اور بولتا چلا جائے۔ ہر چند کہ یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اسے چھوڑنا ہو گا۔ اس وقت صرف احمد ہمیش۔

احمد ہمیش کا زمانہ تو وہ تھا...... جب ہم دونوں ہی ہوا کے دوش پر، تراپڑ تراپڑ پھرا کرتے تھے۔ ہم دن بھر ''انارکلی'' میں گھومتے رہتے کہ میرے والد کی دکان انارکلی میں تھی۔ وہ ایک بڑے سٹیشنرز اور اعلیٰ ترین فونٹین پن کے امپورٹرز تھے۔ میری پیدائش سے پہلے یعنی طلوعِ پاکستان سے بھی بہت پہلے، چند ہی مسلمان دکاندار انارکلی میں کاروبار کرتے تھے جو لاہور کا سب سے بڑا تجارتی بازار تھا۔ بمبے کلاس ہاؤس، چائنا مارٹ، شیخ عنایت اللہ اینڈ سنز، اے احمید اینڈ سنز سٹیشنرز اور اللہ بخش اینڈ سنز۔ انارکلی سے باہر نگینہ بیکری اور محکم الدین بیکری بھی مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ باقی تمام غیر مسلم ہندو سکھ وغیرہ تھے (حتیٰ کہ پاک ٹی ہاؤس بھی انڈیا ٹی ہاؤس تھا۔ جو ایک سکھ کی ملکیت تھا جو بعد میں سراج الدین صاحب کو الاٹ ہو گیا اور جنہوں نے 1949ء میں اس کا نام پاکستان ٹی ہاؤس میں بدل دیا تھا)

حلقہ ارباب ذوق ہی وہ انسٹیٹیوٹ ہے جس نے بے شمار ادیبوں، شاعروں اور نئے لکھاریوں کی تہذیب کی۔ انہیں بولنا سکھایا، دوسرے کا اختلاف سننے کے لیے برداشت پیدا کی۔ ن م راشد سے عابد علی عابد، سبط حسن، اشفاق احمد، انتظار حسین، محمد صفدر میر جیسے جید لوگوں کو سن سن کر مجھ ایسوں نے اپنے ذوق کی آبیاری کی۔ مگر برسوں اپنی رائے کا اظہار نہ کیا...... صرف سنا۔

مگر احمد ہمیش چند اجلاس اٹینڈ کرنے کے بعد ہر تنقیدی اُلجھن کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ حدود سے تجاوز بھی کر جاتا۔ ایک مرتبہ شامت اعمال سے وہ منیر نیازی سے مکمل واقف نہ ہونے کے سبب اس سے شدید اختلاف کر بیٹھا...... کسی دلیل کے بغیر...... اسی میں انسانی انا کی تسکین کی بیماری چھپی ہے اور لکھنے پڑھنے والوں میں تو بنیادی شے یہی انا ہی تو ہے۔ جب منیر سے اُلجھنا ہمیش نے موقوف نہ کیا تو منیر نیازی نے غور سے نحیف و نزار احمد ہمیش کی طرف کڑکتی نگاہ سے دیکھا اور کہا:

''جناب صدر! ان صاحب کو دلیل کی نہیں گرائپ واٹر کی ضرورت ہے'' قہقہے اور مسکراہٹیں مہکنے لگیں جس کا اثر لیے بغیر ہمیش بھی نہ رہ سکا اور مسکرانے لگا۔

والد صاحب کے کاروبار کی وضاحت اس لیے درمیان میں آ گئی کہ میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا کچھ حصہ انارکلی میں ہی گزرا تھا۔ نگینہ بیکری سے فریش ٹی ہاؤس اور پھر کافی ہاؤس کی طرف میری مراجعت اور اس کے بعد کبھی جیب اجازت دیتی تو پاک ٹی ہاؤس جا پہنچا اور اگر فلمی گانوں کی خواہش ہوتی تو ''ممتاز ریسٹورنٹ'' جو ایبک روڈ کے عین سامنے واقع تھا اور ہر گن رَس رکھنے والا رسیلے اور ہمیشہ جوان گیتوں کے لیے وہاں جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اکثر ادیب و شاعر بھی وہاں مل جاتے تھے اور میرزا ادیب تو دفتر ادب لطیف کے بعد ضرور وہاں محفل جماتے۔ ان کی محفل میں عزیز اثری، افسانہ نگار عبدالسلام، ابن انشا کے چھوٹے بھائی جو ''لاہور اکیڈمی'' کے مالک تھے اور خواتین ناول نگاروں کے روایتی ناول شائع کرتے تھے۔ ان کے علاوہ میرزا ادیب کے ساتھ وہ مہمان بھی ہوا کرتے جو دوسرے شہروں سے اس دن ادبِ لطیف کے دفتر وزٹ کرنے آئے ہوتے تھے۔ ادب لطیف کا دفتر ادیبوں اور خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کا مرکز تھا جو چوپال کا روپ دھار چکا تھا۔

میں ان دنوں احمد ہمیش کو ساتھ لیے لیے پھرتا

تھا۔ ہر ایک سے ملواتا کہ اُس کا اکیلا پن مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ ایک روز فرینڈ ٹی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے احمد ہمیش نے ایک کاغذ نکالا اور بولا "سنو! یہ تازہ نظم نہیں ہے جب میں احمد بزمی تھا تب لکھی تھی مگر شائع کرانے کی ہمت نہ تھی۔ اب میں احمد ہمیش ہوں...... سناؤں؟"

"ضرور" میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ اس نے نظم سنائی۔

"کالے شہر کی ایک ڈگر پر، بکھرے تھے شیشے کے ٹکڑے......" میں نے ساری نظم توجہ سے سنی تب اس نے نہایت نستعلیق لہجے میں مجھ سے سوال کیا "آپ کو یہ نظم کیسی لگی؟"

مجھے واقعی یہ نظم بہت عمدہ لگی تھی۔ معاشرے کے تضادات، اونچ نیچ اور ناہمواریوں پر ایک احتجاج بھی تھا اور مظلوم اور محکوم لوگوں کی محرومیاں بھی اُجاگر کی گئی تھیں۔ سو دل کو لگی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔

"اسے ہم امروز کے ادبی ایڈیشن میں شائع کرائیں گے۔"

"کیا واقعی؟" وہ تحیر کی سرشاری میں تھا۔ کیونکہ امروز کا ادبی ایڈیشن نہایت معیاری اور اعلیٰ ترین اقدار کا امانت دار تھا۔

میں نے بات بڑھائی "اسے شائع کرانے کے لیے ابھی کچھ کرتے ہیں۔"

یہ کیسا جملہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا میں نے احمد ہمیش کا دل مٹھی میں لے لیا ہے۔ وہ غور سے میری طرف تکتا رہا گویا اسے یقین نہ آیا ہو۔

"یہ ممکن ہوگا؟"

میں نے دوٹوک جواب دیا "امروز کے دفتر چلنا ہوگا...... ابھی"

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرینڈ ٹی ہاؤس کے بالکل سامنے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی دیوار تھی۔ جس میں لوہے کا ایک دروازہ نیم وا رہتا تھا۔ اس سے گزر کر خوبصورت راستہ جو پھولوں سے سجا رہتا تھا اور تھوڑا آگے میو ہسپتال بازو پھیلائے آنے والے مریضوں کو خوش آمدید کہا کرتا تھا۔ چاروں اور سرسبز درخت اور سکون تھا۔ کیا امن و آشتی کا وہ زمانہ کبھی لوٹ کر آ سکے گا؟ شاید نہیں۔ گزرا وقت اور بہتا پانی کبھی نہیں لوٹتے۔ خاموشی گہرے سناٹوں سے لپٹی رہتی۔ مریضوں اور طلبا کے لیے کوئی ہارن بجاتا تھا نہ شور شرابے کا سامان کرتا تھا۔ ہم دونوں چند منٹ میں "پروگریسو پیپرز لمیٹڈ" کی بلڈنگ کے سامنے کھڑے تھے۔

یہ وہ تاریخی بلڈنگ تھی جہاں سے پاکستان ٹائمز، امروز، بعد میں ہفت روزہ لیل و نہار اور سپورٹس ٹائم شائع ہوا کرتے تھے۔ امروز میں بہت سے دوست بھی تھے۔ بہت سوں سے علیک سلیک بھی تھی۔ میں اور احمد ہمیش اس بلڈنگ کے سامنے کچھ دیر رُکے رہے اور خاموش اس بلڈنگ کے شکوہ کو تکتے رہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے احمد ہمیش اس بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے سے گریزاں ہو۔

وہ بے حد محتاط تھا۔ نظم کو کھڑے کھڑے اس نے دوبار پڑھا بھی۔ اور ایک جگہ کومہ کا اضافہ بھی کیا۔ آپ کو شاید حیرت ہو رہی ہو کہ یہ وہی احمد ہمیش ہے جسے آپ نے بہت بعد میں دیکھا۔ مگر...... جی ہاں یہ وہی احمد ہمیش تھا۔

بے حد نستعلیق، منکسر المزاج، دھیما اور وضع دار۔ خصوصاً لفظوں کے چناؤ میں اس کا انتخاب بہترین ہوتا تھا۔ سو آپ کو "جناب، محترم" وغیرہ اس کی گفتگو کا حصہ بھی تھا انداز بھی اور خوبی بھی۔

"یہ نظم ضرور چھپے گی...... تمہیں صرف میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" میں نے احمد ہمیش کا بازو تھام لیا۔

ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے اور ادبی صفحے کے انچارج صاحب کے کمرے میں جا کر جس اعتماد کے ساتھ ہم نے وہ نظم ان کے حوالے کی وہ بھی ایک واقعہ ہے۔ ان صاحب نے لمحوں میں نظم کا جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنی دراز میں رکھ لی۔ ہم دونوں واپس آتے ہوئے ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ مجھے لگتا تھا من بھر بوجھ میرے سر سے اُتر گیا ہے۔

احمد ہمیش اس لیے بھی خوش تھا کہ نظم چھپے گی اس کی اشاعت کے تصور سے وہ سرشار تھا۔ مگر دوسری خوشی اس بات کی تھی کہ نظم کے شائع ہوتے ہی اس کا معاوضہ بھی ملے گا۔ ان دنوں نثر کا معاوضہ 7 روپے فی کالم ملتا تھا اور غزل یا نظم کا بالمقطع 10 روپے۔ یہ دس روپے اتنے طاقتور تھے کہ جس دن منیر نیازی کو کسی غزل یا نظم کا معاوضہ ملتا، بقول اس کے وہ افراطِ زر کا شکار ہو جاتا تھا۔ کافی ہاؤس میں ہاف سیٹ چائے آٹھ آنے میں ملتی دو آنے ٹپ۔ کل دس آنے میں دو آدمیوں کے لیے سامانِ عیش تھا۔

مگر منیر نیازی ان دس روپوں کو اپنے حساب سے پیائش کیا کرتا تھا۔ ساڑھے چار روپے کا کوارٹر اور ساڑھے پانچ روپے میں بہترین کھانا اور چائے اور اعلیٰ ترین سگرٹوں کا پیکٹ سمیت واپسی کا کرایہ بھی۔

مگر میرا اور احمد ہمیش کا اس وقت کا مسئلہ یہ تھا کہ دوپہر کی بھوک چمکنے لگی تھی میرے پیٹ میں اور احمد ہمیش کے چہرے پر۔ ہم دونوں نیلا گنبد کے چوک میں آ اُترے اور انارکلی میں گھس گئے۔ میں نے سوچا لوہاری سے پٹھورے کھالیں گے یا دہلی دربار ہوٹل میں چھ چھ آنے کی ہاف پلیٹ دو دو آنے کی دو دو روٹیاں یہاں ٹپ وپ تو ہوتا نہیں تھا سو ہم دونوں کا کل خرچ سوا روپیہ بنتا تھا کہ واپسی پہ نگینہ بیکری کی چائے بھی اسی میں تھی۔ یعنی چار آنے میں دو چائے کی پیالیاں۔ اس وقت میری جیب میں اڑھائی روپے تھے جو آج کے لیے بہت کافی تھے۔

ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ عین انارکلی کے درمیان میں "کرنال شاپ" کے عین بالمقابل شیخ عبدالماجد کی دکان بھی پڑتی تھی۔ ماجد صاحب اس خاندان سے تھے جن کا بڑا کاروبار تھا۔ کرنال شاپ بھی ان کی ہی تھی۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالمالک نے "مالو شو کمپنی" کی بنیاد بھی رکھ دی تھی جو شوز فیکٹری تھی۔ یہ کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا بعد میں

CamScanner

"کوٹ عبدالمالک" بھی مالک صاحب نے ہی بسایا جواب لاہور کی ہی اضافی بستی ہے۔ ان کی حیثیت بتانے کے لیے یہ تفصیل ضروری تھی۔ ماجد صاحب کی دکان ان سب سے الگ تھی۔ دکان کیا تھی دوستوں کے لیے مہمان خانہ تھا۔ کاروبار بھی، دفتر بھی، مہمان خانہ بھی۔ یہاں شیخ عبدالماجد ہم جیسے نو وارد اور "فارغ البال" ادیبوں شاعروں کے لیے ہمہ وقت محفل جمائے رکھتے تھے۔ چائے کھانا اور محبت سے لبریز پرتپاک استقبال۔ اس کے بعد لطیفے، قہقہے، خودساختہ کہانیاں اور پرلطف چائے۔ سب سے بلند اور بھرپور قہقہہ شیخ ماجد لگاتے۔ ہنسنا اور خوش رہنا ان کی ہابی تھی۔ علاوہ ازیں انہیں کہانی لکھنے کا ٹھرک بھی تھا۔ ان کی کہانی جب شائع ہوتی اس رسالے کے سرورق پر انہیں کی تصویر بھی چھپا کرتی۔ پورے صفحے پر۔ پیر محمد ضمیر کا رسالہ "رنگ زمانہ" ان کے لیے مخصوص ہو چکا تھا اور پورے صفحے پر تصویر شائع کرانا ان کا جنون اور پیر محمد ضمیر کی ضرورت بھی تھی۔ سو رنگ زمانہ کا آخری سرورق یا سرورق اُلٹتے ہی دوسرے صفحے پر ان ہی کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ قصہ مختصر ماجد صاحب اچانک سامنے آ گئے۔ تپاک سے ملے ان کی مسکراہٹ قہقہے میں ڈھل چکی تھی۔

"برادر......" ان کا یہی انداز تھا [بلکہ ابھی تک ہے۔ ہمارے بزرگ ہیں مگر اپنا دوست ہی سمجھتے ہیں اور مجھے "میرا ہم عصر" کہہ کر اپنے پوتوں سے ملواتے ہیں] میں اور احمد ہمیش اندر آ گئے۔

میں نے ہمیش کا تعارف کرایا "یہ احمد ہمیش صاحب ہیں نو وارد ہیں۔ زبردست شاعر ہیں مگر لاہور میں بالکل اکیلے ہیں۔"

تین منٹ گزرے ہوں گے کہ گلاسوں میں چائے آ گئی جو ہمیشہ گلاسوں میں ہی ملا کرتی تھی۔ چائے کا یہ عمل ہر آدھ گھنٹے بعد دہرایا جاتا رہا۔ میرے اصرار پر احمد ہمیش نے "شیشے کے ٹکڑے" والی نظم کچھ اس رکھ رکھاؤ سے سنائی کہ ماجد صاحب سے پکی دوستی ہو گئی۔

اصل میں شیخ ماجد کو جب یہ معلوم ہوا کہ احمد ہمیش کا معاملہ تنہائی، اکلاپا اور بے روزگار ہونا ہے اور موصوف شاعر بھی ہیں اور "پھرتے ہیں میر خوار" والا قصہ ہے تو اس جذباتی اور دریا دل عبدالماجد نے فوراً ہی ایک بات طے کر دی کہ آپ کا روزانہ کا ناشتہ (احمد ہمیش کا) ہمارے ذمے ہوگا۔ مگر اس کے لیے ملاقات ضروری ہے۔ لہٰذا ہر روز تشریف لانا ہوگا۔ ناشتے کے لیے روزانہ آپ کی خدمت میں ایک روپیہ پیش کیا جائے گا۔ چائے تمام دن جب آپ کو ضرورت ہو یہاں سے ملے گی۔ وغیرہ

یہ گویا معاہدہ تھا۔ یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ 1960ء کی دہائی میں ایک روپیہ کس قدر مضبوط تھا۔ مجھے یاد ہے یہ معاہدہ مہینوں بلکہ بہت مہینوں تک چلتا رہا۔ کیونکہ شیخ عبدالماجد خاندانی، وضع دار اور ادیبوں اور شاعروں کو بہت عزت و تکریم دینے والے تھے اور خدمت کر کے خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے احمد ہمیش کو بہت عزت دی اور ہمیش نے بھی اس معاہدے کو گوارا کر لیا اور لاہور شہر میں رچے خلوص اور زندہ دلی کا ذکر بھی مجھ سے کئی مرتبہ کیا۔ یہ گویا سکون کی ایسی گھڑی تھی جسے احمد ہمیش نے بے حد آسودگی کا باعث جانا۔

جس دن احمد ہمیش کی نظم امروز میں شائع ہوئی وہ سرتاپا خوش تھا۔ اس کے ہاتھ میں امروز تھا جس کی بدولت اس کا اعتماد دوگنا ہو چکا تھا کہ امروز، لیل و نہار میں شائع ہو جانا ایک سند کا درجہ رکھتا تھا۔ ہفتہ بھر بعد جب احمد ہمیش کو نظم کا معاوضہ ملا تو وہ دس روپے کا کڑکڑاتا نوٹ لے کر سیدھا میرے ہی پاس آیا تھا۔ اس نے اس وقت جو جملہ کہا تھا مجھے آج بھی یاد ہے۔

اس نے خوش کن مسکراہٹ اور روشن آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہا "آپ میرے ساتھ چائے پینا پسند کریں گے؟"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی جیب میں پورے دس روپے موجود ہیں۔ مگر وہ اصرار سے بولا "آ جائیے نا" اس نے آج مجھے بازو سے پکڑا اور بڑے اعتماد سے کافی ہاؤس لے آیا۔ جو سکون، آسودگی اور سرشاری اسے آج کافی ہاؤس میں چائے پیتے اور بیٹھتے ہوئے ہو رہی تھی وہ ایک الگ قسم کا رنگ تھا۔ اس نے بڑے ہی طمطراق سے آرڈر دیا تھا۔ جب چائے آئی تو نہایت محبت سے میرے لیے چائے بھی بنائی تھی اور نہایت خلوص سے مجھے پیش کر کے گویا ایک بڑا فرض ادا کر دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب سے اس فرض یا قرض کو اتارنے کے لیے بے چین تھا۔ اس شاعر کے اندر کا انسان زندہ تھا اور مضطرب بھی۔ اس نے فراخ دلی سے کلفٹن کے سگریٹ کا پیکٹ منگوایا اور میرے سامنے رکھ دیا اور کہا "تمہارے لیے"۔

میں نے سگرٹ سلگا لیا "تم نہیں پیو گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "میں آپ کو بتانا بھول گیا ہوں کہ مجھے ٹی بی ہے۔ میں تیسری سٹیج کا مریض ہوں مگر یونس جاوید میرے اندر جینے کی اُمنگ اس قدر زیادہ ہے کہ میں دیر تک زندہ رہوں گا۔ ہر چند کہ یہ بیماری بڑی رومانٹک اور ایک سے دوسرے میں منتقل ہونے والی ہے۔ مگر ہماری کہانیوں میں اسے بہت پینٹ کیا جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ خطرناک بھی ہے۔"

میں یہ سن کر ڈر گیا تھا۔ مگر احمد ہمیش سے محبت اور دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا کہ اب دوستی، دردمندی کا روپ دھار چکی تھی۔ میں نے سگرٹ بجھا کر دل ہی دل میں اس کے لیے دعا کی اور اس کے علاج کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس وقت میں یہی کچھ کرنے کے قابل تھا۔ مگر اگلے ہی روز جب اس بات کا تذکرہ میں نے یوسف کامران سے کیا تو اس شاہ زادے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یوسف تو خیر پہلے سے ہی سرخ و سفید تھا۔ اب اس کا سارا لہو چہرے پر آ گیا

تو میرا خیال تھا وہ ہمیش سے ملنے جلنے سے گریز کرنے کا کہے گا۔ مگر جب اس نے کہا ''یونس جاوید فکر کی کوئی بات نہیں۔ آج کے دور میں یہ کوئی بڑی بیماری نہیں، میڈیسن کی دنیا کے انقلاب نے اس بیماری کو معمولی بخار کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم احمد ہمیش کا علاج کرائیں گے اور اچھے ڈاکٹر سے......'' اس وقت احمد ہمیش موجود نہیں تھا۔ تاہم یوسف کامران پوری دلچسپی سے تمام وقت ہمیش کے علاج کے لیے پروگرام مرتب کرتا رہا۔ اس نے کاغذ پر نوٹ کرنا شروع کر دیا۔ پہلا چیک اپ کہاں اور کس ڈاکٹر سے کرانا ہوگا۔ اگر ہوسپٹل میں داخلہ ناگزیر ہوا تو کس ہوسپٹل کو ترجیح دی جائے گی۔ پارسی ڈاکٹر بروچے جو نہایت مخلص اور دردمند معالج مشہور تھا اور کم قیمت بھی تھا معائنہ اس سے کرایا جائے یا مہنگے ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے۔

میں تو کچھ بولا نہیں تھا۔ یوسف خود ہی کاغذ پر اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچتا رہا۔ آدھ گھنٹے میں اس نے اضطراب میں پانچ سگریٹ بھی پھونک ڈالے تھے اور پروگرام بھی مرتب کر لیا تھا۔

اسی اثناء میں احمد ہمیش کیفے میں داخل ہوا۔ یوسف نے فوراً اُٹھ کر نہایت تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ خود کرسی سرکا کر بیٹھنے کے لیے دی اور احمد ہمیش کے بیٹھتے ہی میر صاحب کو دو انڈے فرائی، مکھن ٹوسٹ اور تھوڑا جیم کا آرڈر دے دیا۔ ساتھ ہی اس نے بہ اصرار ہمیش سے کہا ''جو کچھ اس ٹیبل پر آنے والا ہے سب تمہیں ہی کھانا ہوگا۔''

''مجھے؟'' احمد ہمیش نے حیرت سے پوچھا ''اور آپ لوگ؟''

''ہم دونوں کھا چکے ہیں۔''

جب آرڈر میز پر لگ چکا تو احمد ہمیش نے دھیمے لہجے میں کہا ''اتنا رچ (Rich) فوڈ تو میں نے ایک وقت میں کبھی نہیں کھایا۔''

''اب تمہیں کھانا ہوگا اور ہر روز'' یوسف نے مسکراتی آنکھوں سے ہمیش کی طرف دیکھا اور بولا ''جانِ برادر یہ تمہارا ناشتہ بھی ہے میڈیسن بھی، صحت اور زندگی بھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جو بھی ادویات تجویز کرے گا وہ بھی باقاعدگی سے تمہیں لینا ہوں گی اور جو پرہیز بتائے گا اُسے بھی از بر کرنا ہوگا۔''

احمد ہمیش نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گھما کر یوسف کامران کی طرف یوں دیکھا جیسے بے یقینی کی کیفیت میں دیکھا جاتا ہے۔

''یہ کس طرح ممکن ہے کامران صاحب؟'' اس نے اپنے شبے کا اظہار کر دیا۔

''Every thing is possible ہمیش صاحب...... کبھی یہ بیماری خطرناک سمجھی جاتی تھی۔ سائنس اور ریسرچ نے اسے معمولی بخار میں بدل کر دیا ہے۔ یہ اب خطرناک بھی نہیں رہی۔ لوگ صحت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ صرف دوا، پرہیز سے۔ Way of life تبدیل کر کے آپ زندگی اور خوبصورتی کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ اپنی دِل مضبوط رکھیں، جینے کی اُمنگ کو جگائے رکھنا ہی بیماری کو شکست دینا ہے۔''

''مگر......مگر سر......'' ہمیش نے ہکلا کر کہا ''میں تو اتنا کچھ افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔''

یوسف نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا ''ہم تو کر سکتے ہیں افورڈ؟ بس...... فیصلہ ہو گیا۔ کل تمہارا چیک اپ ہوگا۔ دن میں ایک مرتبہ انڈے دودھ...... سہ پہر کو پھل یا جو بھی ڈاکٹر تجویز کرے۔ وہ سب اور میڈیسن اپنے وقت پر۔ پرسوں مجھے چھٹی ہے۔ تم صبح ساڑھے دس بجے ''پاک ٹی ہاؤس'' آ جاؤ۔ سارا پروگرام طے ہے۔ وہیں سے آغاز کریں گے OK؟''

احمد ہمیش کچھ نہ بولا تو یوسف نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یونس جاوید ...... ڈن...... تم بھی ساڑھے دس تک آ جانا۔''

اس نے ساتھ ہی بل کے لیے میر صاحب کو آواز دی۔ میر صاحب تھے تو 'کافی ہاؤس' کے ویٹر...... مگر ہر بل کے ساتھ اساتذہ کا ایک نہ ایک شعر بھی سنایا کرتے تھے۔ میر صاحب آئے تو یوسف نے کہا ''میر صاحب آج کا بل...... اور شعر بھی۔''

بل سامنے رکھتے ہوئے میر صاحب نے کہا ع

''وہ کیا تھا سن، عجب تھا سن لیے تھے سن ترے گفتگو''

لفظوں کی ایسی استادی اور میر صاحب کا حافظہ...... دوسرا مصرعہ یوں تو یاد نہیں مگر حسن کاری کے لیے لفظ تھن، بھن اور تھن کا استعمال پر لطف ضرور تھا۔ اور ہماری زوال پذیر تہذیب کا عکاس بھی جس نے ہمیں ان حالوں پہنچایا تھا۔

یہ سلسلہ شروع ہوا۔ یوسف نے نہایت پابندی سے ہمیش کے لیے سب کیا تو اس معاملے میں دوسرے ادیبوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا اور مجھے قیوم نظر صاحب کا وہ واقعہ تو ابھی تک یاد ہے جب حبیب جالب کے یاد دلانے پر کہ ہمیش کا حساب کافی ہاؤس میں پچاس سے اوپر نکل گیا ہے اور وہ اندر گروی پڑا ہے۔ قیوم نظر صاحب نے فوراً وہ بل چکا یا۔ (اس میں کچھ دوسرے لوگوں نے حصہ تو ڈالا تھا مگر وہ اپنا نام نہیں بتانا چاہتے تھے)۔

احمد ہمیش کو اپنے ساتھ لے کر سیدھے انارکلی میں مشہور حجام کے پاس لائے۔ (جو دھنی رام روڈ کی بغلی گلی میں مستیے خاں چائے والے سے متصل کاروبار کرتا تھا) احمد ہمیش کی حجامت بنوائی اور لمبے بالوں کو ترتیب میں کرایا۔ جس سے ایک نیا احمد ہمیش نمودار ہو گیا۔ صحت مندی کی طرف لوٹتے ہوئے خوش نمائی کے ساتھ پر پُرزے نکل آنے کے بعد ایک نیا احمد ہمیش ہمارے سامنے تھا۔ وہ شہر شہر گھومنے لگا۔ خصوصاً منٹگمری (ساہیوال) میں شعرا کا مہمان بھی رہا اور بطور خاص مجید امجد صاحب کے ہاں کافی دن قیام کیا۔ جو احمد ہمیش کے لیے کسی بھی اعزاز سے کم نہ تھا۔ (ان دنوں کی ساری تلخ باتیں اور ناگفتنی واقعات حذف کرتا ہوں جو ہمیش سے سرزد ہوئے۔) البتہ تھوڑا ذکر کرتا چلوں کہ وہاں سے اگلے شہر جاتے ہوئے وہ امجد صاحب کی کچھ خاص کتابیں اور کپڑے اور کچھ دوسری

CamScanner

اشیا ساتھ لے گیا۔ میں نے ریکارڈ درست کرنے کے لیے 8 نومبر 14ء کو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب سے تصدیق چاہی۔ انہوں نے فرمایا ''جی ہاں...... یہ درست ہے'' انہوں نے اضافہ کیا کہ ''میں نے یہ بات مرحوم شیر افضل جعفری صاحب سے جھنگ میں پوچھی تو وہ مسکرائے اور کہا'' سامان تو میرا بھی کچھ تھا مگر اسے ضرورت ہوگی تب ہی لے گیا نا۔''

ہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ اس کی کچھ اور نظمیں بھی مجھے یاد آنے لگی ہیں۔ حافظے میں شاید اس لیے رہ گئیں کہ نہایت مختصر ہیں۔ مثلاً اس کی ایک نظم تھی ''دف بجاتی ہوئی عربی لڑکی...... دف بجاتی ہوئی عربی لڑکی...... دف بجاتی ہوئی عربی لڑکی''

یہ نظم اس نے مزنگ کے ادبی حلقے میں نظم کے مشاعرے میں سنائی تھی۔ اسی طرح ایک ہی مصرے کو تین مرتبہ پڑھا تھا کہ دف بجاتی ہوئی عربی لڑکی کی تصویر بن کر سامنے آ گئی۔ اسی حلقے میں نظم ہی کے مشاعرے میں اس نے اس سے بھی مختصر نظم سنائی۔ اس نظم کے تذکرے دنوں رہے اور وہ دیگر ادبی حلقوں میں متعارف ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس نظم نے اس کی شہرت میں بنیادی کردار اس لیے ادا کیا تھا کہ جس تک پہنچی وہ اسے کہیں واقعے کے طور پر اور کبھی لطیفہ کے طور پر آگے سناتا چلا گیا۔ مجھے یاد ہے جب احمد ہمیش کا نام پکارا گیا تو ڈائس پر آ کر اس نے کہا ''حضرات میری نظم کا عنوان ہے ''شاعر اور چپ'' نظم ملاحظہ فرمائیں ''شاعر اور چپ'' احمد ہمیش اس کے بعد خاموش کھڑا رہا۔ سامعین نظم کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مگر ہمیش جوں کا توں کھڑا رہا۔ تقریباً ڈیڑھ منٹ چپ کھڑا رہنے کے بعد ہمیش واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے نظم ''شاعر اور چپ'' کا عملی اظہار کر کے ڈرامائی عناصر سے اس کی توسیع بھی کر دی...... توضیع بھی۔

یہ نظم دنوں ایک واقعے کے طور پر سنائی جاتی رہی۔ بعد میں حوالے کے طور پر بھی۔ بعض لوگ اسے نیا پن کہتے بعض جدیدیت اور تجریدیت پر سر کھپاتے۔ سو احمد ہمیش کا ذکر اس حوالے سے یہاں وہاں مہینوں رہا۔ انہیں دنوں ایک روز وہ اچانک غائب ہو گیا۔ دنوں تک اس کی خبر نہ ملی۔ اصل میں وہ پاکستان میں تھا ہی نہیں۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اب میرا دل واپس لوٹنے کو چاہتا ہے۔ بعد میں سنا کہ وہ واقعی بھارت لوٹ گیا ہے۔

بہت عرصہ تک اس سے رابطہ ٹوٹا رہا۔ کوئی سال دو سال کے درمیانی عرصے میں مجھے اس کا پوسٹ کارڈ نہایت باریک موتیوں جیسے خوشخط لفظوں سے مزین مگر المناک داستان کو پروئے ملا۔ کاش وہ پوسٹ کارڈ میں سنبھالے رکھتا۔ اس نے لکھا تھا کہ ''میں تو اپنی جنم بھومی میں رچ بس گیا تھا کہ ایجنسی والوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں کچھ عرصہ پاکستان میں رہا تھا۔ انہوں نے میری آواز سنی نہ فریاد۔ نہ انہوں نے میری محبت کی پروا کی۔ نہ اس شادی کی جس سے میں نے خود کو مکمل کر لیا تھا۔ مگر ان ظالموں نے مجھے اکھاڑا بھی توڑ بھی دیا اور مجھے کھوکھراپار کے صحرا میں پھینک دیا۔''

اس نے چالیس روز کی صعوبتوں کے دردناک سفر کی داستان اسی پوسٹ کارڈ میں مختصراً رقم کر دی تھی۔ وہ صحرائی چلچلاتی دھوپ اور بھوک پیاس کا سمندر تیرتے تیرتے اپنی صحت پھر سے کھو بیٹھا تھا۔ ایک بے جان میت جو لڑکھڑا کر چل بھی سکتی ہو۔ وہ احمد ہمیش نہ تھا۔ ظالموں کے ظلم کا استعارہ تھا۔ نشان تھا۔ داستان تھا۔ اس کے دوبارہ واپس آنے کو لوگوں نے مختلف عنوانات دیے۔ تب وہ لاہور میں زیادہ عرصہ رکا نہیں تھا۔ کراچی جیسا روشنیوں کا شہر اس کے لیے شہر اماں بن گیا۔ جسے اس نے اپنی منزل قرار دے دیا تھا۔

....

اب یاد نہیں کتنا عرصہ گزر گیا۔ کم از کم لاہور اور لاہور والوں سے اس نے ربط و ضبط رکھا ہی نہ تھا۔

ایک روز پریس کلب لاہور میں مبارک احمد صاحب نے سارہ شگفتہ (مرحومہ) پر ایک زبردست پروگرام ترتیب دے رکھا تھا۔ مجھے خصوصی طور پر شرکت کی دعوت تھی۔ جب میں ہال میں داخل ہوا تو ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ دروازے کے پاس رک کر میں نے اندر کا جائزہ لیا۔ ہال کے ایک کونے میں مبارک احمد اور کچھ لوگ جمع تھے۔ جلسہ شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ مجھے دور سے احمد ہمیش دکھائی دیا۔ کیمل کلر کھدر کا کرتہ پاجامہ...... کافی صحت مند اور کسی حد تک فربہ۔ پہلی نگاہ میں دیکھ کر ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ شخص کبھی بیمار تھا نہ ہے۔ خوبصورت بال، بڑی بڑی آنکھیں، سلیقے سے گفتگو کرتا ہوا، مسکراتا ہوا۔

مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ ایک ہم دمِ دیرینہ کے ملنے سے جس سرشاری نے مجھے لپیٹ رکھا تھا اس میں کمال کی کھٹاس مٹھاس تھی۔ میں رک کر دیکھنے لگا کہ مجھے مبارک احمد کی منفرد آواز سنائی دی۔ مبارک احمد کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ انہوں نے مسرت سے بھیگے لہجے میں زور سے کہا ''احمد ہمیش! تمہارا یونس جاوید بھی آ گیا ہے۔''

میرا خیال تھا احمد ہمیش مڑے گا...... مجھے دیکھے گا اور پھٹ پڑے گا۔ مجھے گلے سے لگا کر میری چیخیں اور اپنا زوردار قہقہہ اُچھال دے گا اور کہے گا ''تم کہاں تھے بھائی ی ی ی...... ؟''

مگر اس نے لحہ بھر انتظار کیے بغیر مبارک احمد سے پوچھا ''کون؟''

''یونس جاوید بھئی'' مبارک احمد نے وضاحت کی۔

''کون یونس جاوید؟'' احمد ہمیش کے ان تین لفظوں نے ہی مجھے ریت کی دلدل میں اُتار دیا تھا کہ اس نے مزید تین لفظ اچھال کر بات مکمل کر دی ''مجھے یاد نہیں۔''

اس مرتبہ وہ خود ریت کی دلدل میں اُتر گیا تھا۔

CS CamScanner

ادب اور فلسطین

ڈاکٹر جمال نقوی

عالمی سماج' جواب ایک گلوبل ویلج بن گیا ہے،اس میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ایسی صورت میں رجعت پرستی کی موت لازمی اور یقینی ہے۔مگر وہ جان کنی کی حالت میں بھی اپنی سانسوں کی مدت بڑھانے کے لئے مسلسل ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔سامراجی طاقتوں کا سورج بلندی پر پہنچنے کے بعد مائل بہ غروب ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ادب جو انسانی زندگی کا آئینہ ہے،اس میں یہ سارے عکس نمایاں نظر آنے چاہیے تھے مگر خاص طور پر اردو ادب آجکل ایک گونہ فراریت کا شکار ہے اور زندگی کے حقائق گریز کر کے شخصی تنقید اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔یوں اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا،اس لئے اس کا قاری بھی اس سے دور ہو گیا ہے۔

آج کے سائنسی دور میں ادب اور خصوصاً شاعری کو وقت کا ضیاع قرار دیا جاتا ہے اور افلاطون کی مثال پیش کی جاتی ہے جس نے اپنی خیالی ریپبک سے شاعروں کو اس لئے باہر نکال دیا تھا کہ اس کے نزدیک شاعری صرف حقیقت کی نقالی ہے اور یہ بھی تیسرے درجے کی کیوں کہ اصل حقیقت کی نقل یہ دنیا ہے اور اس نقل کی نقل شاعری۔ یہ درست ہے کہ اگر ادب کا مقصد صرف نقالی ہے تو سماج کو ایسے ادب کی کیا ضرورت ہے۔مگر ارسطو نے شاعری کی تعریف اس طرح کی ہے کہ وہ تخیل کے ذریعہ سے فطرت کے امکانات کی از سر نو تعمیر کرتی ہے،اس طرح داخلی طور سے انسان کو بدلنے میں مدد دیتی ہے۔ارسطو کے اس معیار پر اگر ہم عالمی شاعری کا تجزیہ کریں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ وہاں شاعر غم کی تصورکشی کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اپنے ذاتی غموں کی نمائش کرے اور سر بازار سینہ پیٹے۔ بلکہ وہ غم کے جذبے کو پوری شدت سے ابھار کر روح کو غم کے جذبے سے پاک کر دیتا ہے۔اس کو کتھارسس کہا گیا ہے۔

ابتداً ہم نے اردو ادب کی منفی صورتِ حال کا ذکر کیا مگر اس کی ایک مثبت صورت بھی نظر آتی ہے اور وہ مختلف زبانوں سے کیے گئے تراجم ہیں۔ جس کے ذریعہ ہم اردو ادب کا تقابل دوسری زبانوں کے ادب سے کر سکتے ہیں اس طرح ہم اپنے ادب کو فروغ دے سکتے ہیں۔اس وقت ہم 'ادب اور فلسطین' کے موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں تو آیئے! ہم فلسطینی ادب سے کئے گئے چند تراجم کے ذریعہ اس بات کا مطالعہ کریں کہ فلسطینی شاعری اور افسانہ نگاری ارسطو کے معیار پر پوری اترتی ہے یا افلاطون کی بات کو سچ ثابت کرتی ہے۔

فلسطین ایک ایسا موضوع ہے جس پر آدھی صدی سے زیادہ عرصے سے بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے۔یہ مظلوم فلسطینیوں کی ایسی دردبھری داستان ہے جو ساری دنیا کے انسان دوستوں کا دردِ مشترک ہے۔ خود فلسطینیوں نے اسے اپنے ادب کا حصہ تو بنایا ہی ہے مگر دوسری زبانوں کے دردمند اور حقیقت پسند قلم کاروں نے بھی اسے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ہم پہلے کچھ فلسطینی قلم کاروں کی تخلیقات کا مطالعہ ترجموں کے ذریعہ کریں گے۔ کچھ اقتباسات دیکھئے: معروف فلسطینی شاعر محمود درویش کے ایک مقدس گیت کے چند بول' دیکھئے جس میں اس نے انقلاب کے بیٹوں اور آزادی کے متوالوں کو امن کے پیمبر قرار دیا ہے:

انقلاب کے بیٹے/ امن کے پیمبر ہیں/ جنکے نام آزادی/ انقلاب کے بیٹے/ آنکھ روشنی کی آنکھ/ظلم و دشمنی میں آگ

ہاتھ روشنی کے ہاتھ/ عدل' دوستی میں پھول/ سارا جسم لوہے کا/ کامران ہر لحظہ/ اور سوچ...... آزادی/ یاد رکھ انہیں دنیا

زندگی انہیں مت بھول (مترجم: امجد اسلام امجد)

ایک اور نظم 'چہرہ' محبوب کی تحریر' میں۔ محمود درویش وطن کو آنکھ اور فلسطین کی دھرتی کو اپنے جسم سے تشبیہ دیتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہیں:

یہ زمیں اک جسم ہے اور آنکھ ہے میرا وطن بچپنے سے میری پیشانی پہ اک خنجر کا زخم تیز ہے اور آج بھی میں

تیری یادوں کے جلو میں جاگتا ہوں

یوں گماں ہوتا ہے جیسے آنے والی ساری خوشیوں کا مکاں موت کے پرلی طرف ہے۔(مترجم امجد اسلام امجد)

فدویٰ طوقان فلسطینیوں کی اپنی سرزمین سے محبت کا اظہار اسی مٹی میں فنا ہو کر مل جانے' پھول بن کر کھلنے اور خوشبو بکھیرنے میں دیکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ:

میرے لئے کافی ہے کہ اسی زمین پر مروں اور اس میں دفن کی جاؤں/ کہ اس کی مٹی میں گھل مل جاؤں اور فنا ہو جاؤں

اور اسی زمین پر گھاس بن کی لوٹوں/ اور پھول بن کر اٹھوں/ میرے وطن کے بچے کا ہاتھ مجھے تھامے

میرے لئے کافی ہے اپنے وطن کے سینے میں ہونا/ بطور مٹی/ اور گھاس/ اور پھول

(مترجم: منیرالدین احمد)

سمیع القاسم کو 'حیاتِ نو' کا یقین ہے۔ بال و پر پھر اُگیں گے۔لمحہ لگے یا صدیاں یہ خون رنگ لائے گا اور وطن کا حصول یقینی بن جائے گا:

اک دن مرے بال و پر پھر اُگ آئیں گے

لوٹ آئے گی دور پڑے وقتوں سے چڑیا جو مقتل سے اڑی تھی

اک دن/ جس نے کہا تھا/ لمحہ لگے یا صدیاں/

لیکن مرا جسم یہ مجھ سے کہتا ہے/ یہ خون آلود ریشے
وطن کا شہپر بن جائیں گے!

(مترجم: افتخار بخاری)

ایک اور نظم میں سمیح القاسم دھرتی ماں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے حوصلے اور یقین کا اظہار یوں کرتے ہیں:

فلسطین! تو، تو مرے بازوؤں میں بھرا خون ہے/ جو ترے دشمنوں کے لئے موت ہے اور مری زندگی ہے

تو کیا میں تجھے غاصبوں کے شکنجے سے آزاد رکھنے کی/ اس جنگ میں/ اک فردِ گمنام رہ جاؤں گا؟/ غیر ممکن.....نہیں

غیر ممکن.....نہیں (مترجم: شوکت ہاشمی)

فلسطینی شاعروں کا یہ طرزِ بیان اس عالمی پیغام کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ظلم کو ہاتھ سے روک سکتے ہو تو روکو۔ ورنہ پھر زبان اور دل سے اس کے خلاف نفرت پیدا ہونی چاہئے۔ تخلیق کار کا قلم ہی اس کی تلوار ہوتا ہے جو دوسروں کے لئے قوت و ہمت بن جاتا ہے۔ ظالم و جابر کی مذمت کرتا ہے اور دوسروں کے دل میں ان کے لئے نفرت پیدا کرتا ہے۔ یہ نفرت ہی ظلم اور ظالم کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مہمیز کرتی ہے۔

شاعروں کی طرح فلسطینی افسانہ نگاروں نے بھی اپنے فکری اور قلمی ہنر کو اسی دردِ مشترک کی تشہیر کے لئے وقف کر دیا ہے اور اس زندہ قوم کے جوان حوصلوں کو ہر ہر انداز سے اپنی تخلیقات کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ غسان کنعانی کا افسانہ 'سعد کی ماں' اس کی ایک مثال ہے۔ جو فلسطینی مہاجرین کے تکلیف دہ کیمپ میں رہتی ہے، اپنی کمزور ہڈیوں اور نحیف جسم کے باوجود گھروں میں کام کرتی ہے مگر زمانے کی شکایت نہیں کرتی۔

اس کا جوان بیٹا مادرِ وطن (فلسطین) غاصبوں سے آزاد کرانے کے لئے فدائین میں شامل ہوگیا ہے۔ فطری طور پر اسے بیٹے کی فکر تو ہے، مگر اس کے حوصلے بلند ہیں۔ ایک مرحلے پر وہ کہتی ہے.......

"کاش! سعد جیسے میرے دس بیٹے ہوتے۔

میرے عزیز! میں بہت تھک چکی ہوں۔ مہاجر کیمپ میں میری زندگی بہت دشوار اور تھکا دینے والی ہے۔ ہر صبح میں خدا سے کہا کرتی تھی۔ میرے خدا! بیس برس گزر گئے اگر سعد فدائین کے ساتھ نہیں جائے گا تو پھر کون جائے گا؟"

(مترجم: ستار طاہر)

دیکھا آپ نے جنگِ فلسطین صرف فدائین کے زورِ بازو ہی پر نہیں لڑی جا رہی ہے بلکہ ایسی ہی حوصلہ مند مائیں اسکی پسِ پردہ طاقت ہیں اور پردے کو اٹھانا قلمکاروں ہی کا کام ہے۔

یحیٰ خلیف نے 'خوددار لوگ' میں محنتی اور خوددار فلسطینیوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ اس میں صالح ابوعلی کا کردار بہت اہم اور طاقتور ہے۔

فلسطینیوں کے دکھ اور درد کو اب عالمی سطح پر محسوس کیا جا رہا ہے اور بہت سی عالمی زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی ادیب و شاعر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔

نامی انصاری نے اپنی نظم 'فلسطین' کے ذریعہ جہد پیہم کو ہی راہِ نجات بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کوئی نغمہ کوئی نعرہ ہم نشیں! / مضطرب خاکِ فلسطیں کے لئے/ جس کے ہر ذرے سے پیدا رنگِ خوں کی داستاں

جس کے روز و شب کا حاصل/ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کا سماں/ مستقل چیخیں، کراہیں، سسکیاں

لیکن اتنی بات میں بھی جانتا ہوں/ جہدِ پیہم کے سوا کوئی نہیں راہِ نجات/ نسلِ آدم کے لئے، ارضِ فلسطیں کے لئے

دیکھئے! یہاں بھی شاعر نے قومی شعور کو انسانی شعور بنا دیا ہے اور جہدِ پیہم کو صرف فلسطین تک محدود رکھنے کے بجائے ایک وسیع تناظر میں 'نسلِ آدم' کی آزادی اور پیکار سے جوڑ دیا ہے۔

عالمی شہرت یافتہ، نین امن انعام سے حامل معروف ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض نے دامے، درمے، سخنے اور قدمے فلسطینیوں کا ساتھ دیا۔ فلسطینی بچے کی لوری، فلسطینی شہدا کیلئے، سر وادیٔ سینا، ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے اور ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لئے جیسی لازوال نظمیں بھی تخلیق کیں اور میدانِ جنگ میں بہ نفسِ نفیس موجود بھی رہے۔ بلکہ وہاں بیٹھ کر ایک اخبار کی ادارت بھی کیا۔ اس طرح کتنے ہی فلسطین آباد کئے:

تیرے اعدا نے کیا اک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کئے کتنے فلسطیں آباد

فیض نے ترانۂ فلسطین لکھ کر مجاہدین فلسطین کو حوصلہ دیا کہ:

ہم جیتیں گے/ حقا ہم اک دن جیتیں گے/ بالآخر اک دن جیتیں گے

اسی لئے تنظیم آزادیٔ فلسطین کے صدر عرفات نے ۱۹ فروری ۱۹۸۱ کو بیروت سے بھیجے گئے اپنے ایک خط میں فیض احمد فیض کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"ہمارے عرب فلسطینی عوام نے آپ کی ذات میں ایک ترقی پسند بین الاقوامی شاعر، دنیا میں امن کے لئے جدوجہد کرنے والا اور ان عوام کا حامی انسان پایا ہے جو اپنی آزادی، ترقی اور بہبود کے لئے کوشاں ہے۔ ہمارے عرب فلسطینی عوام آپکی دوستی، آپکے گہرے شعور اور فلسطین کے مسئلے کے لئے نیز فلسطینی عوام کے جائز حقوق کے حصول کے لئے آپکی جدوجہد پر فخر کرتے ہیں۔"

اس طرح عالمی سطح پر فلسطینی اور گر دوسرے قلم کاروں نے مسئلہ فلسطین کو ایک احتجاجی ادب کی صورت میں پیش کر کے امر بنا دیا ہے اور فدائین کو حقوق انسانی کی جنگ کا ہیرو۔ مجھے یقین ہے کہ ادب کے لایا ہوا انقلاب اور مجاہدین کی مسلسل جدوجہد انہیں کامیابی سے ہمکنار کرے گی۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

عطاء الحق قاسمی/ لاہور

گرم گرم تلی ہوئی مچھلی کھانے کے لیے میں شہر کے پر رونق علاقے میں واقع ایک چھوٹی سی دکان میں داخل ہوا تو بجائے سڑک کی طرف منہ کرنے کے میں دکان کے عقب میں کھلنے والے دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا جسے اندر سے کنڈی لگا کر بند کیا گیا تھا میں نے مچھلی کا آرڈر دیا اور اپنے سامنے بچھی ہوئی میز کے باوجود خاصہ مخمصے میں مبتلا رہا کہ اپنی کہنیاں کہاں جماؤں کیونکہ میز پر گلاسوں سے گرے ہوئے پانی، مچھلی کے کانٹوں اور چکناہٹ کے دھبوں کے بعد کہنیاں جمانے کے لیے کوئی خاص جگہ باقی نہیں بچی تھی تھوڑی دیر میں بیرا ایک پلیٹ میں مچھلی اور ایک میں نان لیے آ گیا اور یوں میری مشکل آسان ہو گئی کیونکہ اب میرے دونوں ہاتھ مصروف ہو گئے تھے یہ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں صرف تین چار میزوں کی گنجائش تھی چنانچہ دکان کے عقب میں کھلنے والا دروازہ مجھ سے صرف چند فٹ دور تھا میں نے ابھی دو چار نوالے ہی لیے تھے کہ بیرا دونوں ہاتھوں میں گندے برتنوں کا ڈھیر اٹھائے دروازے کی طرف گیا اور اس نے کمال مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ہاتھوں میں برتنوں کے ڈھیر کی وجہ سے اپنی انگلیوں سے دروازہ کھولا اور پھر میرے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ دروازے کے بالکل ساتھ ایک وسیع و عریض قبرستان تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ دکان دراصل قبرستان کے اندر واقع ہے اور یوں میں عین قبرستان کے اندر بیٹھا مچھلی کھا رہا ہوں۔ بیرا ایک قبر کے پاس بیٹھا برتن دھو رہا تھا۔ یہ قبر مجھ سے زیادہ سے زیادہ پانچ سات فٹ کے فاصلے پر تھی مجھے یوں لگا جیسے میں مچھلی نہیں مچھلی کے کانٹے چبا رہا ہوں اور ایک بڑا سا کانٹا میرے حلق میں پھنس گیا ہے۔ میرے عقب میں واقع سڑک پر انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو سائیکلوں موٹر سائیکلوں، کاروں سکوٹروں، بسوں اور ویگنوں پر افراتفری کے عالم میں کسی بے سمت منزل کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا اور میرے سامنے قبریں تھیں جن میں انہی انسانوں کے بھائی بند مردہ جسموں پر کفن اوڑھے پڑے تھے!

یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا کچھ بھی نہیں زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ تم ڈیڑھ پاؤ مچھلی میرے لیے بھی منگواؤ بیرے سے کہو مسالہ ذرا کم چھڑکے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر موجود قبر میں سے ایک مردہ باہر نکل کر میرے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور اب وہ میرے بی ہاف پر بیرے کو آرڈ دے رہا تھا!

میرا تصور اتنا سٹرانگ تھا کہ مجھے یہ سب کچھ بالکل حقیقت کی طرح محسوس ہوا تاہم یہ سب کچھ تصوراتی ہونے کے باوجود ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی مگر اگلے ہی لمحے میں مکمل طور پر نارمل ہو گیا یار یہ تم خواہ مخواہ میرے پیسے ضائع کراؤ گے تم مچھلی کیسے کھا سکتے ہو تم تو مردے ہو میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

اس کے جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا ''بہت خوب'' ''میں اگر مردہ ہوں تو کیا تم زندہ ہو؟ تم تو ان سب لوگوں کو بھی زندہ سمجھ رہے ہو گے جو سامنے سڑک پر افراتفری کے عالم میں منہ اٹھائے بھاگے جا رہے ہیں۔

تم تو مجھے طنز و مزاح نگار لگتے ہو میں نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوتے کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے

شیکسپیئر نے کہا ہے نام میں کیا رکھا ہے اس نے میری پلیٹ میں سے مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہونے کہا۔ '' ویسے میرا نام غمگین اندوہ پوری ہے۔'' ''غمگین اندوہ پوری میرے لہجے میں حیرت تھی۔ نام تمہارا غمگین ہے مگر باتیں تو بہت زندہ دلی کی کرتے ہو؟

انسان جتنا غمگین ہو اس کی باتوں میں اتنی ہی زندہ دلی ہوتی ہے''!

بہت خوب تو غمگین صاحب زندگی میں آپ کیا کرتے تھے۔

یہی جو اس وقت کر رہا ہوں

کیا مطلب؟''

مطلب یہ کہ مفت بری کرتا تھا'' جہاں چار لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے ہوتے میں ان میں شامل ہو جاتا!''

تب تو آپ خاصی ناپسندیدہ شخصیت ہوں گے؟''

واہ صاحب یہ آپ نے کیا بونگی ماری ہے ہمارے معاشرے میں تو وہ لوگ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جو دوسروں کی محنت پر پلتے ہیں۔

یہ سب بڑے بڑے جاگیر دار کیا کرتے ہیں ''محنت کوئی کرتا ہے'' کھاتے یہ ہیں بلکہ اسمبلیوں میں محنت کرنے والوں کی نمائندگی بھی یہی کرتے ہیں۔ مشیر وزیر بھی یہی لوگ ہوتے ہیں۔ افسوس کہ آپ نے مجھے بہت انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے

معافی چاہتا ہوں غمگین صاحب اصل میں....

آپ اس بات کو چھوڑیں میرے لیے بیرے کو اس کوڈ میں مچھلی کا آرڈر دیں جس سے وہ سمجھ جائے کہ آپ نے ٹرخانے کے لیے آرڈر نہیں دیا بلکہ آپ سچ مچ چاہتے ہیں کہ آرڈر کی تعمیل کی جائے کیونکہ وہ ابھی تک مچھلی نہیں لے کر آیا اور ہاں دو نان بھی منگوا لیں، اسے کہیں ذرا سینک کر لائے!''

غمگین صاحب آپ تو یونہی میرے بارے میں بدگمانی سے کام لے رہے ہیں۔

بدگمانی سے کام لینا ضروری ہے اس قوم کو خوش گمانیوں ہی نے تو مارا ہے گزشتہ 43 برسوں میں ہر آنے والی حکومت پبلک کے سامنے یہی اعلان کرتی ہے کہ ان کے لیے روٹی کپڑے کا آرڈر دے دیا گیا ہے مگر چونکہ آرڈر دیتے ہوئے ایک مخصوص اشارے سے سمجھا دیا جاتا ہے کہ اس کی تعمیل نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ عوام حکمرانوں کو نیک دل سمجھتے رہتے ہیں اور ان کے اہلکاروں کو برا کہتے ہیں۔ معاف کیجیے گا حضرت میرے ساتھ یہ تکنیک نہیں چلے گی؟''

خدا کا شکر ہے کہ بیرا تھوڑی ہی دیر بعد ایک پلیٹ میں ڈیڑھ پاؤ مچھلی اور دو نان لے کر آ گیا جس

CS CamScanner

پر میں نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ غمگین اندوہ پوری نے اپنے جملوں سے مجھے بھی ادھ موا کر دیا تھا۔"

"یہ بتائیں آپ کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے دانستہ موضوع بدلتے ہوئے کہا کیا مطلب

مطلب یہ کہ آپ کے مردہ بھائی بند آج کل کیا کر رہے ہیں!"

ہڑتال پر ہیں۔

ہڑتال پر ہیں؟ وہ کیوں؟"

اکثر مردے ان دنوں بغیر کفن کے دفنائے جا رہے ہیں!"

میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔

یہ کوئی ایسی ناقابل فہم بات نہیں گزشتہ دنوں جو الیکشن ہوئے اس میں سڑکوں پر امیدواروں نے اتنے بڑے بڑے بینر لگوائے جس سے کپڑے کی شارٹیج ہو گئی اور یوں اس کی قیمتیں آسمان کو پہنچ گئیں چنانچہ ان دنوں بیشتر مردے انہی کپڑوں میں دفن ہیں جو انہوں نے مرتے وقت پہنے ہوئے تھے آپ میرے ساتھ آئیں میں آپ کو دکھاؤں کوئی دھوتی باندھ کر لیٹا ہوا ہے کسی نے کھیس اوڑھا ہوا ہے کوئی چوڑے گھیرے والی شلوار پہنے ہوئے ہے اور یہ سب لوگ احتجاج کر رہے ہیں کہ انہیں کفن مہیا کیا جائے۔

"عجیب بات ہے۔"

"ہاں، مگر اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ الیکشن سے پہلے جو مردے کفن میں دفنائے گئے تھے وہ ان سے زیادہ پریشان ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ الیکشن کے دوران سیاسی جماعتوں کے رہنما اپنے کارندوں کے ذریعے ان کے کفن بھی اُتار کر لے گئے اور اس کے بینر بنا لیے۔ اب یہ بیچارے ننگے پڑے ہیں۔ خود میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے میں یہ کفن اپنے ساتھی سے ادھار مانگ کر لایا ہوں۔ اس نے دے تو دیا مگر درخواست کی کہ یار ذرا جلدی آ جانا کہ اگر اس دوران فرشتے آ گئے تو میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

"یہ تو آپ مجھے بہت عجیب و غریب باتیں بتا رہے ہیں۔" میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"صاحب! یہ تو کچھ بھی نہیں میں آپ کو ایک اور عجیب بات بتاتا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"ان دنوں کچھ مردے ایسے بھی آئے ہیں جن کے لواحقین نے کفن کے لیے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر بچے کھچے بینر اُتار کر اس کے کفن بنائے۔ چنانچہ بہت سے بینروں پر بڑے بڑے وعدے لکھے ہوئے ہیں۔"

"واقعی!"

"تو کیا میں آپ سے جھوٹ کہوں گا؟ اور ہاں ان مردوں کی وجہ سے قبرستان کے سکون میں خلل بھی بہت پڑا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"یہ بے وقوف الیکشن گزرنے کے بعد بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے اُمیدوار کے حق میں "آوے ای آوے" کے نعرے لگانے لگتے ہیں۔"

"اس وقت آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں صرف آمین کہتا ہوں۔"

"غمگین اندوہ پوری نے کھانا ختم کر لیا تھا، اب وہ غٹاغٹ پانی پی رہا تھا۔ میں نے جیب میں سے بٹوا نکالا اور پانچ سو روپے کا نوٹ بیرے کو دیا کہ باقی پیسے واپس لے آؤ۔"

"ایک ڈبی گولڈ لیف کی بھی لیتے آنا۔" غمگین اندوہ پوری نے بیرے کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، میں نے بقیہ رقم بٹوے میں ڈالتے ہوئے غمگین سے مخاطب ہو کر کہا اور پھر میں اس سے اجازت طلب کرنے ہی کو تھا کہ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "آپ سے ایک درخواست کرنا تھی۔"

"فرمائیے۔"

"مجھے چند ہزار روپے اُدھار چاہئیں۔"

"وہ کیوں؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں یہ کفن اپنے ساتھی سے اُدھار مانگ کر لایا ہوں۔"

"ہاں"

"اب میں واپس جاؤں گا تو وہ فوراً اُتروا لے گا۔ دیکھیں نا کوئی آ ہی جاتا ہے کتنی بری بات ہے؟"

"ہاں ہے تو سہی، مگر آپ ان ہزار روپوں کا کیا کریں گے؟"

"اپنے لیے کفن خریدوں گا۔"

"وہ کیسے؟"

چند روز پہلے ایک صاحب دفن ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ولایتی لٹھے کے کئی تھان لے کر آئے تھے اور اب بلیک کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک آدھ دانہ ہی بچا ہے ویسے وہ یہ بات دام بڑھانے کے لیے کئی دنوں سے کہہ رہے ہیں لیکن ممکن ہے اس دفعہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں۔

"میں نے بٹوے میں سے پیسے نکالے اور غمگین اندوہ پوری کو دیتے ہوئے کہا:

"یہ میرے پاس آخری ہزار تھے جو پیش خدمت ہیں۔ صرف یہ فرما دیں کہ اس رقم کی واپسی کب ہو گی؟"

"جب آپ دنیا کے جھمیلوں سے فارغ ہو کر ہمارے درمیان تشریف لائیں گے۔" غمگین اندوہ پوری نے کہا" اور انشاءاللہ آپ جلد آئیں گے۔"

"آپ کو یہ بددعا دیتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔" میں نے اس ساری گفتگو کے دوران پہلی دفعہ غمگین کو غصے سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں اگر آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا ہے مگر بہت سے لوگ صرف اپنی ڈوبی ہوئی رقم کی وجہ سے فوت ہو جاتے ہیں۔ کل ایک شیخ صاحب دفن ہونے کے تھوڑی دیر بعد اُٹھ بیٹھے اور پوچھنے لگے کہ وہ مردود شیدا کہاں ہے جو میرے پانچ ہزار روپے مار کر یہاں آ گیا ہے۔

ضبط کے باوجود بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی۔ میں غمگین اندوہ پوری کو داد دینے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی شانوں پر رکھنے ہی کو تھا کہ وہ اچانک میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ قبرستان کی طرف کھلنے والا دروازہ ابھی تک کھلا تھا مگر میں نے اپنا رخ بازار کی طرف کر لیا جہاں انسانوں کا ایک ہجوم سائیکلوں، موٹر سائیکلوں، کاروں، سکوٹروں، بسوں اور ویگنوں پر افراتفری کے عالم میں کسی بے سمت منزل کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔

میرزا مُفتہ

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

یہ اپنے آپ کو میرزا اسداللہ خاں غالب کے شاگردِ شوخ مرزا تفتہ کے خاندان کا آخری چشم و چراغ بتاتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ میرے لگڑدادا مرزا مغلوب علی اپنے نام کی تاثیر کے سبب میرزا سے اتنے مرعوب تھے کہ 'دیوانِ غالب' کو بنا تیمم ہاتھ تک لگانا گناہ سمجھتے تھے۔ جس طرح ناصر کاظمی کے بارے میں کسی جل ککڑے نقاد نے کہا تھا:

شعر ہوتے ہیں میر کے ناصر
لفظ کچھ دائیں بائیں کرتا ہے

اسی طرح ان کی بابت بھی لوگوں کا متفقہ حسد ہے کہ موصوف نے تمام عمر غالب سمیت مختلف شاعروں کی جوتیاں سیدھی اور مصرعے دائیں بائیں کرنے میں گزار دی۔ اسی سلسلۂ مُفتیہ میں ان کا ایک شعر آپ بھی دیکھیے:

تُو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
مَیں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

شروع شروع میں اس نے خود بھی شاعری میں منھ مارا۔ غالب کے شاگرد مولانا حالی سے متاثر ہونے کی بنا پر 'حال' تخلص رکھا، جس پر قریبی حلقے کے لوگ اِسے 'ابوالحال' کے نام سے یاد کرنے لگے۔ چنانچہ خوفِ فسادِ حلقہ کے پیشِ نظر شاعری سے تائب ہو کر، روایتی زبان و ادب کا محتسب بن بیٹھا اور اَلَم ناک موضوعات پر عِلم ناک باتیں کرنے لگا۔ اکثر کہتا کہ اگر منٹو والا افسانہ مولانا طارق جمیل لکھتے تو اس کا نام یقیناً 'توبہ تیک سنگھ' ہوتا۔ ''پسِ پُشت ڈالنا'' والے محاورے کے بارے میں کہتا ہے کہ اگر اسے محاورے کی پشت پناہی حاصل نہ ہوتی تو اس سے زیادہ قبیح ترکیب اُردو ادب تو کیا دنیائے بے ادبی میں بھی ڈھونڈے سے نہ ملتی۔ پھر جس طرح یوسفی صاحب نے لکھا کہ اصل لفظ 'قیمص' تھا، اس پر نقطہ انگریزوں اور درزیوں نے لگایا، اسی طرح 'نہ ہوگا بانس، نہ بجے گی بانسری' والی کہاوت کی بابت مرزا مُفتہ کا اصرار ہے کہ اس میں 'بانس' کا لفظ بانسری کی صوتی رعایت اور کاتب کی شرارت سے بار پا گیا، حالانکہ اصل لفظ 'سانس' تھا: یعنی 'نہ ہوگا سانس، نہ بجے گی بانسری'۔ ... بعینہٖ 'غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی' والے زبان زدِ عام شعر سے متعلق بھی اس کی تحقیق بتاتی ہے کہ اس کا شاعر اصل میں گُردوں کے مرض میں مبتلا تھا، جو ڈائلسز کا وقت ختم ہونے کے بعد ہر بار پڑھا کرتا:

گُردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی

گاؤں سے قصبے، قصبے سے شہر اور شہر سے بڑے شہر تک آتے آتے اس نے اتنی ذاتیں بدلی ہیں کہ آپ اسے کم ذات کسی صورت نہیں کہہ سکتے، البتہ جب ہمارے ہاتھ لگا تو عرصۂ سادات میں تھا۔ زمانۂ پیدائش ہی سے چائے کا اتنا شوقین کہ جب اس کے منھ میں دودھ کے دانت ہوا کرتے تھے، شنید ہے کہ یہ اُن میں بھی پتی ملا کے پی جایا کرتا۔ جوانی میں تو یہ شوق، ہوش رُبا شکل اختیار کر گیا اور اس کے قلم سے اس طرح کے مطلعے طلوع ہونے لگے:

تیرے ہاتھ کی چائے جاناں
ہائے، ہائے، ہائے جاناں

جب سے ہمارے عظیم لیڈر کا ''کام، کام اور کام'' والا قول مقبول ہوا، دیکھنے میں آیا ہے کہ، لوگوں کا، سی کام، ڈی کام، آئی کام، بی کام کی طرف رجحان بڑھتا چلا گیا۔ نئے زمانے میں ہاٹ کام، ڈاٹ کام کا رواج ہوا۔ ہم جیسے پینڈو کہیں کہیں 'جاٹ کام' سے بھی کام چلا لیتے ہیں لیکن اس مردِ استقام نے تمام عمر 'ڈونٹ کام' ہی سے واسطہ رکھا۔ اس کا منشور بھی عین مین ابنِ انشا والا ہے کہ ''آنے والے کل میں تمھیں جو کام کرنا ہے، اسے آج پرمت ڈالو!''

سیاست اور ازدواجی زندگی میں مسلسل ناکامیوں کے باوجود، دونوں سے متعلق اس کا شعور کافی پختہ ہو چکا ہے۔ ایک زمانے میں'' در جوانی شادی کردن شیوۂ پیغمبری'' کا راگ الاپا کرتا تھا۔ انھی دنوں ایک لڑکی اس کی زبان درازی سے متاثر ہو کر زبان سیکھنے آئی اور زبان دے کر چلتی بنی۔ شادی کسی ہال میں ہونے کی بجائے اُسی حال میں ہو گئی لیکن کسی نگران، حیران، نادان اور ویران حکومت جتنی پائیداری بھی نہ دکھا سکی۔ کچھ ہی عرصے بعد مرزا ظاہر دار بیگ کے اس بڑے بھائی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے جاتے ہوئے موصوفہ نے جو تبصرہ کیا، وہ پورے محلّے میں آج بھی زبان زد ہے، فرماتی ہیں:

''فی زمانہ سید بننے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا لیکن یہ حرکت فرمانے سے قبل بندے کو ڈھنگ سے اپنے موروثی طبلہ سارنگی، عادی فنکار باپ اور جملہ افرادِ خاندان کے گُوڑھے پکے رنگ، مخصوص لب و لہجے اور شجرۂ جدید کے بارے میں بھی کوئی خاطر خواہ بندوبست تو کر لینا چاہیے۔''

شادی کے شعبے میں کھیت رہنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہتا ہے: مَیں نے اس کے لیے زیادہ تگ و دَو اِس لیے نہیں کی کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر ایوانِ بالا سے سرخرو ہو بھی گیا تو ایوانِ سالا میں مارا جاؤں گا، کیونکہ موصوفہ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں جذبۂ حبِ الہتنی پیدا ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔ شادی شدہ زندگی کی جانب بے رغبتی کی وجہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دو چار سال بعد شادی تو کہیں دنیا کے دھندلکوں میں گم ہو جاتی ہے، پیچھے شدہ ہی شدہ رہ جاتا ہے۔

سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو کئی حوالوں سے اس کا فیورٹ رہا ہے۔ اس کی بابت بھی کہتا ہے: وہ اگر

اپنے اندر کے نواب کو کسی طرح مارنے میں کامیاب ہو جاتا تو نواب شاہ کے زرداری کو نہ یاد کروانا پڑتا کہ 'آج بھی بھٹو زندہ ہے۔' اگلی نسل کو تو یہ خاطر میں ہی نہیں لاتا۔ کہتا ہے: بے نظیر کو سیاست، فراست اور ریاست ورثے میں ملی تھی لیکن تجاست اور حراست اس کی اپنی پسند تھی۔ مزید کہتا ہے: عوام کو مطمئن یا متاثر کرنے کے لیے تو وہ والد والی دانائی یا ڈرامائی صورت کبھی نہ پیدا کر سکی، ہمیشہ ہوشیاری، عیاری اور زرداری سے کام لینے کی کوششوں میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بین الاقوامی سیاست سے متعلق اس کا تبصرہ ہے کہ: امریکا کے ذہنی خناس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ان کے صدارتی محل کا نام ہی 'وائٹ ہاؤس' ہے۔ وہاں کالوں کے حقوق کی بات بھلا کیسے ہو سکتی ہے؟ ایک دن پاکستان کی موجودہ سیاست پہ بات چل رہی تھی کہ حکیم جی فرمانے لگے: مجھے یقین ہے کہ اگلے الیکشن میں عمران خان کلین سویپ کرے گا۔ جھٹ بولا: ''حکیم جی یہ محض آپ کی خان خیالی ہے۔''

موصوف نے زندگی میں کئی روگ اور دو کتے پال رکھے تھے۔ دونوں سگان گھر کے بالائی حصے کا اقتدار سنبھالے رہتے۔ کبھی کھانے پینے کے معاملات میں دونوں میں کتیا کتیا ہو جاتی تو یہ اُنھیں دیکھ دیکھ اپنی یہ نظم پڑھتے: دو اِی کتے/ دونویں اُتے/ اِک دو جے تے/ دن بھر بھونکے/ رات پئی تے/ رَل کے سُتے/ دونویں کتے

کہتا ہے، جس طرح دو دہائیاں قبل پنجاب میں ہر دسویں لڑکے کا نام ریاض ہوا کرتا تھا، اگر بھلے وقتوں میں اسی حساب سے لڑکیوں کا نام 'ریاضی' رکھنے کا رواج پڑ گیا ہوتا تو یہ دقیق مضمون نئی نسل میں اتنا مرغوب ہو جاتا اور گلیوں بازاروں میں انجینئر وں، مہندسوں کی ایسی بہتات ہوتی کہ آلو، چاول، تربوز، شلجم، منھ دیکھتے رہ جاتے۔ حالانکہ اس کی اپنی ریاضی دانی کا یہ عالم ہے کہ ایک دن ہم پوچھ بیٹھے کہ آپ کی جیب میں کتنے پیسے ہیں؟ کہنے لگا: سولہ ہزار چودہ سو۔ کسی نے لقمہ دیا کہ آپ سترہ ہزار چار سو بھی تو کہہ سکتے تھے۔ بولا: کیسے کہہ دوں؟ اس میں سولہ ہزار بیگم کے اور چودہ سو میرے ہیں۔ مجھ میں ان رقوم کو گڈمڈ کرنے کی ہمت نہیں۔

مذہب کی طرف سے اس کا ہاتھ ذرا تنگ ہی ہے، جس کی وجہ علما کی تنگ نظری بتاتا ہے۔ کہتا ہے شروع شروع میں جس بھلے لوک سے بھی واسطہ پڑا، اس نے یہی سمجھا سمجھا کے بلکہ ہمارا تراہ نکالے رکھا کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ کسی اللہ کے بندے کو آج تک یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ بتاتا، بھئی اگر کسی بھلے لوک نے موت کو سَوت جان کے زندگی سے ناطہ گانٹھنے کا ارادہ کر لیا تو جینے کے بعد کیا ہوگا؟

جس طرح لکھنو میں سموسے کو تکونا، بستر کو بچھونا کہا جاتا ہے، اسی طرح ہر چیز پہ نظر رکھنے کی بنا پر ہم اس کو ڈرون سے ڈرونا کہہ سکتے ہیں۔ خوش فہم ایسا ہے کہ اگر کبھی موبائل فون والی حسینہ بھی اسے 'معزز صارف' کہہ کر پکار لے تو پھولے نہیں سماتا۔ ادبی دنیا کے بارے میں بھی اس کے تبصرے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ کالم نگاری کا شوق ہوا تو سرسید سے لے کے اوریا مقبول تک تمام مقبول اور دستیاب مواد کو سڑک ڈالا۔ جمیل جالبی کے کالموں کے مجموعوں 'دعا کر چلے'، 'صدا کر چلے' کے مطالعے سے فارغ ہوا تو کہنے لگا: ان کے جو کالم کتابی شکل اختیار کرنے سے محروم رہ گئے ہیں، ان کو جمع کر کے نام رکھا جائے: 'کیا کر چلے؟' اپنے زمانے کے ایک نامور اور تغیر پسند کالم نویس کی وسیع الغرنی، فحش گوئی، آزاد خیالی اور خواتین کی جانب غیر معمولی رغبت دیکھ کے کہنے لگا: حضرت! یہ جو کچھ آپ کی ترجیحات و ترغیبات ہیں، انھیں سیکولرازم نہیں، سیکسولرازم کہتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ صحافت میں منھ مارا، جہاں ہر طرف جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کے اَن تھک کارخانے لگے ہیں۔ جب اس کوچے میں دل نہ لگا، یا دال نہ گلی تو اس شعری تبصرے کے ساتھ اخباری دنیا کو خیر باد کہہ دیا کہ:

صحافت سے بنتا ہے کیسے صحافہ؟
لفافہ، لفافہ، لفافہ، لفافہ

مرزا اس نئی نسل سے ہر روایتی بزرگ کی طرح نالاں ہے، کہتا ہے: ہمارے زمانے اچھے تھے جب ٹیلی فون کسی کے کھونٹے سے بندھی بہو بیٹیوں کی مانند ڈیوڑھی بیٹھک میں ڈیکوریشن پیس کی طرح دھرا رہتا تھا۔ اب یہ کیسا زمانہ آن لگا ہے کہ ہر کہ ومہ کے بچے ساری ساری رات ایک دوسرے کا فون چوستے رہتے ہیں۔ کبھی سوشل میڈیا کے ذریعے دوسروں کی پوسٹوں میں ٹانگ اڑاتے ہیں اور کبھی کسی پہ اچانک شب فون مارتے ہیں۔ اس کے باوجود ناشتے کی میز پر ان کی اڑی اڑی سی رنگت دیکھو تو صاف لگتا ہے کہ ان میں تازہ فون کی کمی ہے۔ انسانی سہولت کے لیے ایجاد ہونے والی ایک ایک ایپ کو انھوں نے عیب بنا کے رکھ دیا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ 'وائف آئی' کی بنا پر خوف زدہ رہتے تھے، یہ ہمہ وقت وائی فائی کے سبب پریشان رہتے ہیں۔ صورتِ حال یوں ہے کہ تعلیم روز افزوں ہے، ذوقِ سلیم سرنگوں ہے جب کہ شرم و حیا ٹکڑوں کوں ہے۔ لگتا ہے یہی فون خرابہ کسی روز اس نسل کی جڑوں میں بیٹھ جائے گا۔

حکیم جی کے بقول مرزا خود ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ ہمیشہ عجیب و غریب سوالات کھیسے میں ڈال کے چلا آتا ہے۔ گزشتہ روز پوچھنے لگا: اگر ایک مکھی میرے ہونٹ سے اُڑ کر محبوب کے رخسار پہ جا بیٹھے تو یہ بوسہ ہوا کہ نہیں؟ کبھی دریافت کرتا ہے کہ شیخو پورہ کے وضو سے لاہور کی نماز ہو جاتی ہے؟ ایک دن بیٹھے بٹھائے کہنے لگا: نیوٹن کا پیوٹن سے کیا رشتہ ہے؟ میں نے جان چھڑانے کے لیے بتایا کہ وہی جو سیب کا جیب، چین کا دین اور چیل کا وکیل سے ہے۔

ایک زمانے میں اُردو ادب کی تحقیق میں بھی منھ مارتا رہا ہے۔ اس کے انوکھے عنوانات والے تحقیقی

مقالوں: حشرات الارض سے حضرات الارض تک ..... اُردو ادب کے زیاں اور سبزیاں ..... بلھے شاہ اَساں مَنتا ناہیں ..... ایوارڈ کی ریتلی زمین پہ اُگا شاعر ..... سیاسی تلوے اور ادبی جلوے ..... اُردو ادب کے محمد شاہ رنگیلے ..... دولت کی دَولتّی اور جانو کپتی ..... ادبی مزارعے اور مجاور، وغیرہ نے تو ادبی حلقوں میں اچھی خاصی آگ لگادی تھی۔

مرزا مُفتہ کے جذباتی دکھ بھی بڑے عجیب ہیں۔ پوری زندگی اسے وقفے وقفے سے سچا عشق ہوتا رہا۔ آخری عمر میں تو شدید والا عشق ہوگیا۔ لالہ کے بقول، عشق کا سیاپا ہی یہ ہے کہ یہ جب بھی ہوتا ہے، شدید ہی ہوتا ہے۔ اس کی قسمت میں دھیرج اور اعتدال ہے ہی نہیں۔ جوانی میں تو اس کو ایک لڑکی بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ راتیں اس کے خوابوں اور دن حسابوں میں گزرتے۔ مرزا ہی کے بقول اس کی آنکھیں غضب، ہونٹ قیامت، گردن صراحی، کمر تباہی، چال کمال، خال جمال، خاص طور پہ اُس کی مستانی چال اور گھنگریالے بال تو دل پہ جادوگریاں کرتے تھے۔ چلتی تو یوں لگتا کہ یہ دل اس کی پتلی کمر سے انکھیلیاں کرتی انھی ناگن زلفوں کے چھلوں میں گرفتار ہے۔ ان گھمن گھیر زلفوں کی چھاؤں میں جگہ پانے کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیا، دعائیں مانگیں، منّتیں کیں، مَنّتیں مانیں، نتیجہ یہ کہ گاہے ماہے بات چیت کا دَر وَا ہوگیا، پھر ہفتے رفتے ملاقات بھی ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے اُس کی سالگرہ کا دن قریب آیا تو مناسب موقع دیکھ کر ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ مَیں آپ کو آپ کی پسند کا کوئی تحفہ دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اُس نے پہلے تو تأمل کیا، اِدھر سے اِصرار بڑھا تو شرماتے ہوئے بولی:

"آپ اس قدر مُصر ہیں تو ایسا کریں کہ مجھے ایک اچھا سا سٹریٹنر دلوادیں۔"

غزلیں

احمد ندیم رفیع/امریکا

سوال میرے ، جواب تیرے
جواب گویا حجاب تیرے
تجھی سے منسوب سارے موسم
یہ دھوپ تیری ، سحاب تیرے
بہار کی نرم رَو ہوا میں
کِھلے ہیں جتنے گلاب ، تیرے
پنپ رہے ہیں جو شاخِ گل پر
وہ رنگ ، خوشبو ، شباب ، تیرے
خیال کی موج پر تھرکتے
اچھلتے ، مٹتے ، حباب ، تیرے
مرے ساعت میں جو بھی گونجیں
وہ شعر و نغمہ ، رباب ، تیرے
کبھی ستارے ترے جلو میں
کبھی دھنک ہم رکاب تیرے
چراغ تیری نظر کا پرتو
فلک سے گرتے شہاب تیرے
مجھے تو موجِ سفر سے مطلب
یہ دشت ، دریا، سراب ، تیرے
جفا کی ساری بلائیں میری
وفا کے جتنے ہیں باب ، تیرے
میں جو بھی سوچوں ، وہ روپ تیرا
میں جو بھی دیکھوں، وہ خواب تیرے
نگارِ عالم کی ساری جہتیں
چھپی ہیں زیرِ نقاب تیرے
مری اجل کے کتابچے میں
لکھے ہیں جتنے ثواب ، تیرے
جنوں کے اسباق میرا جھنجھٹ
محبتوں کے نصاب تیرے
وہ مر گیا ہے ، یہ جاں بلب ہے
طرح طرح کے حساب تیرے
یہی طریقت ہے میرے غم کی
رہوں میں زیرِ عتاب تیرے

✦✦✦

بزم میں باعث تاخیر نہ ہونے پائے
ہم کبھی تیرے عناں گیر نہ ہونے پائے
جانے کس بات کی دُھن تھی کہ ترے دیوانے
تابعِ زلفِ گرہ گیر نہ ہونے پائے
وحشت دل نے جنھیں چین سے رہنے نہ دیا
وہ کسی پاؤں کی زنجیر نہ ہونے پائے
تُو مبادہ کہیں پڑھ لے مرے چہرے کے نقوش
ہم ترے سامنے دلگیر نہ ہونے پائے
ایسا کیا جُرم کیا تیرے خطا کاروں نے
پھر کبھی لائقِ تعزیر نہ ہونے پائے
کِھچ گئے ہیں مرے چہرے پہ لکیروں کی طرح
وہ خیالات جو تحریر نہ ہونے پائے
بس گئے ہیں مری آنکھوں میں سیاہی بن کر
رنگ جو رونقِ تصویر نہ ہونے پائے
اب ڈراتے ہیں مجھے ریت کی آندھی بن کر
وہ محلّات جو تعمیر نہ ہونے پائے
ہم کو دکھلائے گئے ایسے درخشندہ خواب
جو کہ شرمندۂ تعبیر نہ ہونے پائے

✦✦✦

نذیر قیصر

ہمارا خواب سچا ہو رہا ہے
دیا بجھ کر ستارا ہو رہا ہے
کبوتر طاقچوں سے اُڑ رہے ہیں
شجر گنبد سے اونچا ہو رہا ہے
کہیں شاخ ستارہ جھک رہی ہے
کہیں پر چاند آدھا ہو رہا ہے
ہوا میں ٹوٹ کر پیپل کا پتہ
گرا ہے اور صحیفہ ہو رہا ہے
میں آدھی رات کا جاگا ہوا ہوں
ترے خوابوں کا پیچھا ہو رہا ہے
کھجوریں دھوپ میں پکنے لگی ہیں
ہمارا دن سنہرا ہو رہا ہے
مرے پیروں میں برسوں کی تھکن ہے
ترا قالین میلا ہو رہا ہے
مرے ہاتھوں میں مٹی کا دیا ہے
مرے اندر اُجالا ہو رہا ہے
یہاں تو رات کے دو بج رہے ہیں
تری جنت میں اب کیا ہو رہا ہے
ترے بھیجے ہوئے پھولوں کو چھو کر
ترا بیمار اچھا ہو رہا ہے

لہروں میں جال ہے کہ سمندر ہے جال میں
اک تشنگی سی بہتی ہے موجِ سوال میں
روشن ہیں اس کے نقشِ قدم میری خاک پر
شعلہ ہے اس کی شاخ کا میری مشعال میں
پھر اس کے بعد لوگ مرے ساتھ چل پڑے
دیکھا تھا میں نے اس کا ستارہ شمال میں
میں چھو کے دیکھتا ہوں اُسے جاگتے ہوئے
رہتا ہے کوئی خواب کی صورت خیال میں
لگتی ہے وہ دھنک کی طرح اور خوشنما
اُڑتی ہے میری دُھول بھی اُس کی دھمال میں
یاد آیا اس کے بھیجے ہوئے پھول دیکھ کر
آتا ہے جنوری کا مہینہ بھی سال میں
موسم بدل رہا ہے درختوں کے پیرہن
دو نام رہ گئے ہیں سفیدے کی چھال میں
گرتے ہیں پھڑ پھڑاتے ہوئے پر ہواؤں میں
یہ رات ہے یا کوئی پرندہ ہے جال میں
پھر یوں ہوا بچھڑتے ہوئے دونوں ہنس پڑے
اُڑنے لگا گلال بھی رنگِ ملال میں
میں نے دیے کی لَو سے تراشا ہے اس کا جسم
کچھ دن رہی ہے رات مرے استعمال میں
وہ بت ہو یا شبیہہِ خدا ناتمام ہے
شامل اگر جمال نہیں ہے جلال میں
قیصر طواف میں ہے ہجوم مہ و نجوم
مٹی کا اک چراغ ہے مٹی کے تھال میں

ہر کسی کو سلام کرتی ہوئی
وہ محبت کو عام کرتی ہوئی
باغ میں ڈوبتا ہوا سورج
شام دن سے کلام کرتی ہوئی
وہی تبلیغ ترکِ دنیا کی
ساری خوشیاں حرام کرتی ہوئی
کھولتی ہے وہ میری زنجیریں
مجھ کو اپنا غلام کرتی ہوئی
صبح آیتوں میں بکھرنے لگی
ایک چہرہ تمام کرتی ہوئی
میرے ہاتھوں کو چوم لیتی ہے
وہ مرا احترام کرتی ہوئی
آدھی چھتری میں بھیگتی لڑکی
بارشیں میرے نام کرتی ہوئی
اس کو بستر سے دیکھتا ہوا میں
اور وہ گھر کے کام کرتی ہوئی
میری شاخوں سے پھول گرتے ہوئے
اور وہ تزئینِ بام کرتی ہوئی
چل رہی ہے ہوا قیامت کی
بستیوں میں قیام کرتی ہوئی

جب کوئی کھڑکی کھلی ملتی ہے
زندگی ہنستی ہوئی ملتی ہے
پھول بیلوں میں کھلے ملتے ہیں
دھوپ سیڑھی میں پڑی ملتی ہے
آسماں ٹھہرا ہوا ملتا ہے
اور ندی بہتی ہوئی ملتی ہے
روز اک اسم کا در کھلتا ہے
روز اک خوش خبری ملتی ہے
صبح ہوتی ہے تو دروازے پر
رات بارش میں کھڑی ملتی ہے
گھر کے پھینکے ہوئے سامان کے ساتھ
عرش کی چابی پڑی ملتی ہے
جس کے خوابوں میں نئی دنیا ہو
اس کو دنیا بھی نئی ملتی ہے
راہ بھولے ہوئے شہزادے کو
کسی جنگل میں پری ملتی ہے
صبر کرنے سے سکوں ملتا ہے
شکر کرنے سے خوشی ملتی ہے
کہیں ملتے ہیں ترے ہاتھ کے پھول
کہیں موم بتی جلی ملتی ہے
کبھی خود سے بھی ملاقات کرو
خود سے مل کر بھی خوشی ملتی ہے
شہر لاہور تری گلیوں میں
جابجا نقش گری ملتی ہے
انہی گلیوں میں کہیں پر قیصر
پھول والوں کی گلی ملتی ہے

سلیم کوثر / کراچی

کہانی لکھتے ہوئے داستاں سناتے ہوئے
وہ سو گیا ہے مجھے خواب سے جگاتے ہوئے

دیے کی لو سے چھلکتا ہے اس کے حُسن کا عکس
سنگار کرتے ہوئے آئینہ سجاتے ہوئے

اب اس جگہ سے کئی راستے نکلتے ہیں
میں گم ہوا تھا جہاں راستہ بتاتے ہوئے

پکارتے ہیں انہیں ساحلوں کے سناٹے
جو لوگ ڈوب گئے کشتیاں بناتے ہوئے

پھر اس نے مجھ سے کسی بات کو چھپایا نہیں
وہ کھل گیا تھا کسی بات کو چھپاتے ہوئے

مجھی میں تھا وہ ستارہ صفت کہ جس کے لیے
میں تھک گیا ہوں زمانے کی خاک اُڑاتے ہوئے

مزاروں اور منڈیروں کے رت جگوں میں سلیم
بدن پگھلنے لگے ہیں دیے جلاتے ہوئے

وسعت ہے وہی تنگیٔ افلاک وہی ہے
جو خاک پہ ظاہر ہے پس خاک وہی ہے

اک عمر ہوئی موسم زنداں نہیں بدلا
روزن ہے وہی دیدۂ نمناک وہی ہے

کیا چشم رفوگر سے شکایت ہو کہ اب تک
وحشت ہے وہی سینۂ صد چاک وہی ہے

ہر چند کہ حالات موافق نہیں پھر بھی
دل تیری طرف داری میں سفاک وہی ہے

اک ہاتھ کی جنبش میں در و بست ہے ورنہ
گردش وہی کوزہ ہے وہی چاک وہی ہے

جو کچھ ہے مرے پاس وہ میرا نہیں شاید
جو میں نے گنوا دی مری املاک وہی ہے

زوروں پہ سلیم اب کے ہے نفرت کا بہاؤ
جو بچ کے نکل آئے گا تیراک وہی ہے

نہ کوئی نام و نسب ہے نہ گوشوارہ مرا
بس اپنی آب و ہوا ہی پہ ہے گزارہ مرا

مری زمیں پہ ترے آفتاب روشن ہیں
ترے فلک پہ چمکتا ہے اک ستارہ مرا

جو چاہتا ہے وہ تسخیر کر لے دنیا کو
کسی بھی شے پہ نہیں ہے یہاں اجارہ مرا

میں ہمکنار ہوا ایک لہر سے اور پھر
کنارے ہی میں کہیں گم ہوا کنارہ مرا

بس ایک لمحۂ بے نام کی گرفت میں ہیں
نہ جانے کیسا تعلق ہے یہ تمہارا مرا

تو پھر جو نفع ہے میں اس میں کیوں نہیں شامل
اگر یہاں کا خسارہ ہے سب خسارہ مرا

جو دھیان تک نہیں دیتا ہے میری باتوں پر
سمجھ رہا ہے وہی شخص تو اشارہ مرا

کہیں خوشی کی نمائش میں رکھ دیا جا کر
کل اس نے بستۂ غم طاق سے اُتارا مرا

وہی ہے تل وہی رُخسار ہیں وہی تو ہے
مگر نہیں : ہے سمرقند اور بخارا مرا

میں باد و باراں سے آتش کشید کرتا ہوں
کہ آب و خاک کی تمثیل ہے ادارہ مرا

اب آ گیا ہوں تو سوچا صدا لگاتا چلوں
کسے خبر یہاں آنا نہ ہو دوبارہ مرا

درونِ خانہ کوئی بھی نہیں کسی کا سلیم
پہ دیکھنے میں تو لگتا ہے شہر سارا مرا

کچھ بھی تھا سچ کے طرف دار ہوا کرتے تھے
تم کبھی صاحب کردار ہوا کرتے تھے

سنتے ہیں ایسا زمانہ بھی یہاں گزرا ہے
حق انہیں ملتا جو حق دار ہوا کرتے تھے

تجھ کو بھی زعم سا رہتا تھا مسیحائی کا
اور ہم بھی ترے بیمار ہوا کرتے تھے

اک نظر روز کہیں جال بچھائے رکھتی
اور ہم روز گرفتار ہوا کرتے تھے

ہم کو معلوم تھا آنا تو نہیں تجھ کو مگر
تیرے آنے کے تو آثار ہوا کرتے تھے

عشق کرتے تھے فقط پاسِ وفا رکھنے کو
لوگ سچ مچ کے وفادار ہوا کرتے تھے

آئینہ خود بھی سنورتا تھا ہماری خاطر
ہم ترے واسطے تیار ہوا کرتے تھے

ہم گلِ خواب سجاتے تھے دکانِ دل میں
اور پھر خود ہی خریدار ہوا کرتے تھے

کوچہ میر کی جانب نکل آتے تھے سبھی
وہ جو غالب کے طرف دار ہوا کرتے تھے

جن سے آوارگیٔ شب کا بھرم تھا وہ لوگ
اس بھرے شہر میں دو چار ہوا کرتے تھے

یہ جو زنداں میں تمہیں سائے نظر آتے ہیں
یہ کبھی رونق دربار ہوا کرتے تھے

میں سر دشتِ وفا اب ہوں اکیلا ورنہ
میرے ہم راہ مرے یار ہوا کرتے تھے

وقت رُک رُک کے جنہیں دیکھتا رہتا ہے سلیم
یہ کبھی وقت کی رفتار ہوا کرتے تھے

وہ جن کے نقشِ قدم دیکھنے میں آتے ہیں
اب ایسے لوگ تو کم دیکھنے میں آتے ہیں

کہیں نہیں ہے منارہ نہ منبر و محراب
محل سرا سے حرم دیکھنے میں آتے ہیں

طواف کوئے سخن ختم ہی نہیں ہوتا
کوئی نہیں ہے تو ہم دیکھنے میں آتے ہیں

اٹے ہوئے ہیں غبارِ شکستگی میں سلیم
جو آئنے پسِ غم دیکھنے میں آتے ہیں

مال گاڑی میں امانتیں

علامہ عبدالستار عاصم/لاہور

ایک خاموش خدمت کی گونجتی دستاویز

مصنف۔محمد حنیف بندھانی

''مال گاڑی میں امانتیں''صرف ایک کتاب نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو ایک دور کی سچائیوں کو کھلی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ یہ داستان ہے ایک عام مگر غیر معمولی انسان کی جو پاکستان کی تاریخ کے اہم ترین موڑ پر ایک غیر معمولی فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہ کہانی ہے چوہدری محمد اسماعیل کی، جنہیں قدرت نے یہ سعادت بخشی کہ وہ قیامِ پاکستان کے بعد دہلی سے پاکستان منتقل ہونے والے سرکاری افسران کا قیمتی سامان، کاغذات، کتابیں، گھریلو اشیاء، فرنیچر اور ذاتی یادگاریں نہایت دیانتداری اور جاں فشانی کے ساتھ پاکستان منتقل کریں۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر چیز غیر یقینی کا شکار تھی، اور نئی مملکت کے لیے بنیادی ڈھانچہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ سرکاری افسروں کی جانب سے ان اشیاء کی منتقلی محض ایک لاجسٹک عمل نہ تھا بلکہ یہ نئی مملکت کے نوآبادیاتی ماضی سے جمہوری حال کی طرف بڑھنے کا ایک خاموش لیکن اہم قدم تھا۔

چوہدری محمد اسماعیل، جو پیشے کے اعتبار سے ایک تجربہ کار اور دیانتدار کنٹریکٹر تھے، نے ایسے وقت میں یہ ذمہ داری قبول کی جب دھوکہ دہی، لوٹ مار اور بدنظمی عام تھی۔ دہلی سے کراچی، لاہور اور دیگر شہروں تک مال گاڑیوں کے ذریعے حساس سامان پہنچانا ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ یہ سامان صرف سامان نہ تھا بلکہ ان افسروں کے خواب، جدوجہد، مطالعہ اور ماضی کی جھلکیاں تھے۔ اس دور میں جب لوگوں کی جان و مال غیر محفوظ تھی، ایک شخص کا اتنی ایمانداری سے قومی امانت کی حفاظت کرنا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔۔ کچھ افسران جیسے کہ سکندر مرزا، جو بعد میں صدر پاکستان بنے، قدرت اللہ شہاب جیسے معروف بیوروکریٹ، اور چوہدری محمد علی جیسے آفیسر بھی اس میں شامل تھے۔

یہ کتاب دراصل صرف ایک شخص کی قربانیوں کا اعتراف نہیں بلکہ ریاست اور اس کے اداروں کی اولین شکل کا تجزیہ بھی ہے۔ یہ پاکستان کی ابتدائی تاریخ کا ایک انمول باب ہے جو بتاتا ہے کہ دیانت، اصول پسندی اور قومی خدمت کا جذبہ رکھنے والے افراد کس قدر نظرانداز کیے گئے۔''مال گاڑی میں امانتیں''دراصل ان سچائیوں کا بیانیہ ہے جو ہماری درسی کتب، سرکاری بیانات اور قومی تاریخ سے کٹ چکی ہیں۔ مصنف محمد حنیف بندھانی نے نہایت باریک بینی، جذباتی سچائی اور تاریخی احتیاط کے ساتھ اس داستان کو قلم بند کیا ہے۔ ان کا یہ کام نہ صرف والد کے لیے ایک خراجِ عقیدت ہے بلکہ ایک نسل کو آئینہ دکھانے کی جرات مندانہ کوشش بھی ہے۔

''مال گاڑی میں امانتیں''میں محمد حنیف بندھانی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس وقت کے معاشرتی، اخلاقی اور انسانی اقدار کی بھی عمدہ جھلک پیش کرتا ہے۔ یہ واقعہ ان کے والد محترم اسماعیل بندھانی سے متعلق ہے، جو اس دور میں سرکاری ملازمت میں فائز تھے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے والد سخت بیمار ہو گئے۔ بیماری کی شدت اس حد تک تھی کہ وہ دو دن تک دفتر نہ جا سکے۔ یہ واقعہ برطانوی راج کے دور کا ہے، جب وائسرائے ہند، جو اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا سرکاری نمائندہ ہوتا تھا، والد کی غیر حاضری سے متعلق جب وائسرائے کو اطلاع ملی تو وہ خود اپنی اہلیہ، جنہیں مصنف ''میم صاحبہ'' کہتے ہیں، کے ہمراہ والد صاحب کی عیادت کے لیے ان کے گھر تشریف لائے۔

ان کے ہمراہ ان کا ذاتی معاون، رام سرندر داس، بھی تھا۔ یہ معاون ایک ہندو تھا، لیکن خاص بات یہ ہے کہ وہ والد صاحب کا قریبی اور ہمدرد دوست بھی تھا۔ اس سے اس دور میں بین المذاہب دوستی اور رواداری کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

جب وائسرائے نے والد صاحب کی طبیعت خراب دیکھی تو فوراً رام سرندر داس کو حکم دیا کہ وہ فوراً ڈاکٹر گپتا کو بلائیں۔ ڈاکٹر گپتا جلد ہی آئے، والد صاحب کا معائنہ کیا اور دوائی دی۔ وائسرائے نے ڈاکٹر کو سختی سے ہدایت کی کہ آئندہ بھی وہی والد صاحب کی صحت کی نگرانی کریں گے، وقتاً فوقتاً دوائیاں دیں گے، اور ان کی دیکھ بھال باقاعدگی سے جاری رکھیں گے۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ہم کراچی میں مقیم رہے۔ اس دوران ایک موقع ایسا بھی آیا کہ والد صاحب کی بیماری کے لیے مخصوص دوا برطانیہ سے منگوائی گئی۔ یہ کام بھی وائسرائے کی خصوصی ہدایت پر انجام پایا، جس سے ان کی دردمندی، احساسِ ذمے داری، اور اپنے ملازمین کے لیے خلوص و محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ واقعہ نہ صرف ایک اعلیٰ سرکاری شخصیت کی انسان دوستی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ایک ایسے معاشرے کی تصویر بھی پیش کرتا ہے جہاں مذہب، عہدہ اور سماجی فرق کے باوجود خلوص، احترام اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا جذبہ باقی تھا

کتاب''مال گاڑی میں امانتیں''کے مصنف محمد حنیف بندھانی اپنے خاندان کی قربانیوں کا ذکر کرتے

ہوئے ایک نہایت دردناک اور دل دہلا دینے والا واقعہ بیان کرتے ہیں، جو قیامِ پاکستان سے پہلے کے فسادات، ہجرت، اور مسلم خاندانوں پر ڈھائے گئے مظالم کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ واقعہ صرف ایک خاندان کی داستان نہیں بلکہ اُس اجتماعی قربانی اور صبر و استقامت کی علامت ہے جو لاکھوں مسلمانوں نے پاکستان کے حصول کے لیے دی۔

مصنف لکھتے ہیں کہ ان کی بہن فاطمہ، ان کی والدہ اور دادی گھر میں موجود تھیں۔ دادی صاحبہ کافی عرصے سے صاحبِ فراش تھیں کیونکہ ایک بار انہیں گائے نے ٹکر ماردی تھی جس کے باعث وہ چلنے سے معذور ہوگئی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ ایک دن اچانک محلے میں خوفناک صورتحال پیدا ہوگئی۔ سرکاری گاڑیوں پر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا جانے لگا کہ کوئی بھی شخص اپنے گھر سے باہر نہ نکلے، ورنہ اسے گولی ماردی جائے گی۔

محلے کی گلی کے ایک کونے پر انڈین فوجی مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ اسی دوران حالات مزید بگڑ گئے۔ ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کے گھروں کو نذرِ آتش کرنا شروع کر دیا۔ فضا میں آگ، دھواں، چیخ و پکار، اور بھاگ دوڑ کا عالم تھا۔ اعلان ہوا کہ سب لوگ جلد از جلد اپنی جان بچا کر جامع مسجد عیدگاہ کی طرف چلے جائیں کیونکہ وہی واحد محفوظ مقام ہے جہاں پناہ لی جاسکتی ہے۔

گھروں کو آگ سے بچانے اور راستہ فراہم کرنے کے لیے انگریز افسروں نے گھروں کے درمیان داخلی راستے بنوائے تاکہ لوگ باہر نکلے بغیر ایک گھر سے دوسرے گھر ہوتے ہوئے محفوظ مقام تک پہنچ سکیں۔ انگریز افسر نہ صرف راستہ دکھاتے رہے بلکہ مسلسل اعلان بھی کرتے رہے کہ کیسے نکلنا ہے، کس طرف جانا ہے، اور کہاں پناہ لینا ہے۔

مصنف بیان کرتے ہیں کہ جب وہ اور ان کا خاندان روانہ ہوئے تو راستے میں جگہ جگہ مردوں اور عورتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ خون میں لت پت جسم، جلی ہوئی دیواریں، چیخوں کی بازگشت اور خوف کا ایسا عالم کہ الفاظ اس کی مکمل ترجمانی سے قاصر ہیں۔ اس افراتفری میں ان کی دادی اور بھائی یوسف گھر پر ہی رہ گئے کیونکہ دادی معذور تھیں اور انہیں ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔

جامع مسجد عیدگاہ پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہاں پہلے ہی ہزاروں پناہ گزین موجود تھے۔ ایک ہجوم تھا جو خوف، بھوک، پیاس اور بے یقینی میں گھرا ہوا تھا۔ نہ کھانے پینے کا کوئی انتظام تھا، نہ سونے یا بیٹھنے کی جگہ۔ ہر طرف آہ و زاری، چیخ و پکار، اور بے بسی کا منظر تھا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ وہ اپنی ماں، بہن اور دیگر اہلِ خانہ کے ساتھ رو رو کر اپنے والد اور دیگر خاندان کے افراد کا انتظار کرتے رہے۔

آخر کار ایک دن فوجی گاڑی میں ان کے والد صاحب کچھ فوجیوں کے ہمراہ عیدگاہ پہنچے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کی بہت سی ضروری اشیاء تھیں۔ جب وہ پہنچے تو بچوں کی آنکھوں میں امید کی چمک عود آئی۔ والدہ نے جب وہ اشیاء دیکھیں تو اپنے لیے بہت تھوڑی سی رکھیں اور باقی تمام چیزیں دوسرے پناہ گزینوں میں تقسیم کر دیں۔ یہ جذبہ ایثار اس خاندان کی انسان دوستی اور سخاوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جب والدہ نے اپنی والدہ (مصنف کی دادی) کے بارے میں دریافت کیا تو ان کے والد نے انتہائی غمزدہ لہجے میں بتایا کہ ہندو بلوائیوں نے دادی کو شہید کر دیا ہے۔ والد نے دکھی دل کے ساتھ ماں کو صبر کی تلقین کی۔ یہ جملہ: "صبر کریں، ان کو ہندو بلوائیوں نے شہید کر دیا ہے"، نہایت گہرے صدمے اور تاریخی سانحے کا نچوڑ ہے۔

یہ واقعہ نہ صرف ایک خاندان کے دکھوں کی کہانی ہے بلکہ قیامِ پاکستان کی قیمت، قربانیوں، اور ہجرت کی اذیتوں کو دل سوز انداز میں پیش کرتا ہے۔ محمد حنیف بندھانی کی تحریر میں سچائی، سادگی اور دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی باتیں شامل ہیں جو قاری کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ اُس قربانی کی شدت کا احساس بھی دلاتی ہیں جو پاکستان کی بنیاد میں شامل ہے۔

یہ اقتباس آج کی نسل کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ وطن جس میں ہم آزادی سے سانس لیتے ہیں، وہ کتنی قربانیوں، کتنے آہوں اور کتنے خون آلود خوابوں کی قیمت پر حاصل ہوا ہے۔

محمد حنیف بندھانی کی تحریروں سے نہ صرف ہجرت کے دردناک لمحات کی تصویر ابھرتی ہے بلکہ اُن کی اپنی عملی کوششیں بھی ایک سچے محبِ وطن کی گواہی دیتی ہیں۔ ان کی ایک نہایت اہم، مگر افسوسناک کوشش وہ ہے جو انہوں نے 1947ء کے اصل اور تاریخی کاغذات، خطوط، اور یادگار دستاویزات کو محفوظ کروانے کے لیے کی۔

محمد حنیف بندھانی کے پاس ایسے نادر اور قیمتی کاغذات موجود تھے جو قیامِ پاکستان کے وقت کے حالات و واقعات، مہاجرت کے سفر، اور فسادات کی حقیقی گواہی دیتے تھے۔ یہ کاغذات ان کے خاندان کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی تھے، جنہیں انہوں نے نہایت محنت اور احتیاط سے محفوظ رکھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آنے والی نسلیں ان دستاویزات کے ذریعے قیامِ پاکستان کی تاریخ کو صحیح اور اصل شکل میں جان سکیں۔

اسی جذبے کے تحت انہوں نے متعدد بار کوشش کی کہ یہ دستاویزات قومی سطح پر محفوظ کر دی جائیں تاکہ انہیں ایک باقاعدہ ورثے کا درجہ حاصل ہو۔ اس

سلسلے میں وہ وزارتِ قومی ورثہ وثقافت، اسلام آباد بھی گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہ کاغذات کسی قومی آرکائیو، میوزیم یا لائبریری میں بطور تاریخی امانت رکھے جائیں تاکہ مورخین، محققین اور طلبہ ان سے استفادہ کرسکیں۔

تاہم، ان کی یہ مخلصانہ کوشش رائیگاں چلی گئی۔ وزارتِ قومی ورثہ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ ان دستاویزات کو محفوظ کرنے یا قبول کرنے کے مجاز نہیں۔ یہ انکار نہ صرف محمد حنیف بندھانی کی ذاتی محنت کی ناقدری تھی بلکہ ایک قومی نقصان بھی۔ کیونکہ جن دستاویزات کو وہ لے کر گئے تھے، وہ صرف ایک خاندان کی یادیں نہیں تھیں بلکہ وہ ایک پوری قوم کی اجتماعی جدوجہد، قربانی اور ہجرت کی زندہ شہادتیں تھیں۔

اس رویے سے محمد حنیف بندھانی کو گہرا دکھ پہنچا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہم بحیثیت قوم کس قدر زوال پزیر ہیں

محمد حنیف بندھانی خود ایک اصول پرست، نڈر اور خداترس شخصیت کے مالک ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ نہایت کامیاب اور تجربہ کار بینکار رہے۔ نیشنل بینک آف پاکستان کے آڈٹ سیکشن میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر کئی دہائیوں تک شفاف مالیاتی نظام کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے صرف ملک میں ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک مختلف بینکوں کے آڈٹ میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ وکالت کے شعبے سے وابستہ ہوئے اور آج سندھ ہائی کورٹ کے ممتاز وکلاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ عدلیہ کی آزادی، انصاف کی سربلندی اور انسانی حقوق کے لیے وکلاء تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ ان کی شخصیت میں ایک نرمی، سنجیدگی اور مقصدیت ہے جو انہیں معاشرے کے دیگر افراد سے ممتاز بناتی ہے۔

ان کی کتاب میں شامل یادداشتیں، تصاویر اور دستاویزات محض تاریخی مواد نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک نسل اور ایک خواب کا بیانیہ ہیں۔ یہ کتاب قاری کو اس دور میں لے جاتی ہے جب پاکستان ایک خواب تھا، ایک امید تھی، اور ہر شخص اس امید میں اپنا کردار ادا کرنے کو بے چین تھا۔ چوہدری محمد اسماعیل نے بھی یہی کیا، مگر جو سلوک ان کے ساتھ کیا گیا، وہ اس تلخ سچ کی نمائندگی کرتا ہے جس کا سامنا کئی ایسے افراد کو کرنا پڑا جو نظریے کے لیے سب کچھ قربان کر بیٹھے۔

کتاب میں بیان کردہ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح پاکستان اور بھارت کے درمیان ابتدائی دنوں میں گاڑیوں کے ذریعے سامان کی ترسیل کا ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ یہ معاہدہ اگرچہ وقتی اور عبوری نوعیت کا تھا، مگر اس کے تحت جو ذمہ داریاں چوہدری محمد اسماعیل جیسے افراد کو سونپی گئیں، وہ ان کے حوصلے، ایمانداری اور اصول پسندی کا کڑا امتحان تھیں۔ وہ مال گاڑی میں صرف سامان نہیں لا رہے تھے، وہ نئی مملکت کی علمی، ادبی، تاریخی اور نفسیاتی میراث محفوظ کررہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جس افسر کا کتابوں سے بھرا بکسہ تھا، ممکن ہے وہی افسر بعد میں تعلیمی پالیسی مرتب کرتا ہو۔ جس کا فرنیچر محفوظ طریقے سے پہنچایا گیا، وہ بعد میں کابینہ اجلاسوں کی میز پر بیٹھا ہو۔

کتاب میں شامل "سعادت مند صاحبزادے" کے عنوان سے ایک باب خاص طور پر متاثر کن ہے۔ یہ باب نہ صرف چوہدری محمد اسماعیل کے فرزند کے طور پر مصنف کی اپنے والد کے لیے جذباتی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ والدین کی عظمت، قربانی اور کردار سازی کے اس عمل کو بھی بیان کرتا ہے جو ایک بچے کو باشعور، ذمہ دار اور قوم کے لیے سودمند فرد بناتا ہے۔ حنیف بندھانی نے نہ صرف اپنے والد کے کارنامے قلم بند کیے بلکہ یہ بھی بتایا کہ انہوں نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کو اصولوں، دیانت اور خدمتِ خلق کے لیے وقف کردیا۔

کتاب میں شامل تصاویر اور دستاویزات صرف نایاب مواد نہیں بلکہ تاریخ کی زندہ شہادتیں ہیں۔ ان کے ذریعے نہ صرف قاری ماضی کے مناظر کو آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے بلکہ محسوس کرسکتا ہے کہ ایک شخص نے کس طرح خلوصِ نیت سے اپنی ذمہ داری ادا کی۔ یہ تمام اشیاء، کتاب کی سچائی اور مصنف کی نیت پر مہر ثبت کرتی ہیں۔ "مال گاڑی میں امانتیں" بظاہر ایک سادہ عنوان لگتا ہے، مگر اس عنوان کے پیچھے ایک پوری تہذیب کی منتقلی، ایک عہد کی صداقت اور ایک انسان کی عظمت پوشیدہ ہے۔

کتاب میں کئی مقامات پر ان افسروں کے نام، عہدے اور مستقبل کے مناصب کا ذکر کیا گیا ہے، جنہوں نے چوہدری محمد اسماعیل کی خدمات سے فائدہ تو اٹھایا مگر بعد میں انہیں مالی و اخلاقی انصاف نہ دیا۔ یہ پہلو ایک قومی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ ہم اکثر اپنے قومی ہیروز کی بات کرتے ہیں، مگر ان غیر معروف، گمنام سپاہیوں کو بھول جاتے ہیں جن کے کندھوں پر یہ مملکت کھڑی ہوئی۔ حنیف بندھانی نے اپنے والد کے ذریعے ایسے ہی ہزاروں افراد کی نمائندگی کی ہے، جو تاریخ کی کتابوں میں جگہ نہ پاسکے۔

یہ کتاب ایک بیٹے کے خلوص، ایک وکیل کی جستجو، ایک مؤرخ کی تحقیق اور ایک سچے پاکستانی کی ذمہ داری کا حسین امتزاج ہے۔ یہ نہ صرف تاریخ کے طالبعلموں، وکلاء، بینکاروں اور پالیسی سازوں کے لیے اہم ہے بلکہ ہر اس شخص کے لیے سبق آموز ہے جو ملک و قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ "مال گاڑی میں امانتیں" اس امر کی گواہی ہے کہ جذبہ، ایمان اور اصول پرستی آج بھی زندہ ہیں، بس ہمیں انہیں پہچاننے، سراہنے اور اپنانے کی ضرورت ہے۔

CS CamScanner

خودمختار عورت

لبنیٰ صفدر

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ہر وہ لڑکی جو خود سے جینے کی کوشش کرتی ہے۔ جو اپنے فیصلے خود کرنا چاہتی ہے۔ جو اپنے جسم، اپنی زندگی اور اپنے خوابوں کی مالک بننا چاہتی ہے۔ اسے پہلے اس کا خاندان مارتا ہے۔ پھر محلہ اس پر تھوکتا ہے۔ اور پھر پورا معاشرہ اسے فاحشہ، باغی اور ''مغرب زدہ'' کہہ کر گردن زدنی قرار دیتا ہے؟ نہیں یہ اتفاق نہیں۔ یہ ایک منظم اور سوچی سمجھی تربیت ہے۔ جو نسل در نسل منتقل ہو رہی ہے۔ یہ ایک ثقافتی نظام ہے۔ جسے ریاستی سرپرستی حاصل ہے۔ جہاں مسجد سے لے کر مدرسے تک اور ٹی وی ڈراموں سے لے کر درسی کتابوں تک عورت کی خودمختاری کو فساد اور مرد کے غصے کو غیرت کا نام دیا جاتا ہے۔

جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں ہر تہذیب میں عورت کو ''دوسرے درجے'' کا شہری بنانے کی دانستہ کوشش نظر آتی ہے۔ یونانی فلسفے سے لے کر ہندو دھرم شاستروں تک عورت کو مرد کا تابع خدمت گزار اور ناپاک قرار دیا گیا۔ ارسطو عورت کو ''ناکام مرد'' کہتا تھا۔ جبکہ منوسمرتی میں لکھا ہے کہ ''عورت کو زندگی بھر مرد کی تابع رہنا چاہیے۔ بچپن میں باپ، شادی کے بعد شوہر، اور بڑھاپے میں بیٹے کے تابع۔''

اسلام نے جب عورت کو وراثت، تعلیم اور انتخاب کی آزادی دی تو یہ صدیوں کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ لیکن افسوس کہ بعد ازاں خلافتوں، بادشاہتوں اور جاگیرداریوں نے دین کے اس روشن چہرے پر اپنی روایات اور مفادات کا نقاب چڑھا دیا۔ اسلام نے عورت کو جو عزت دی، اسے اسلامی معاشروں نے واپس چھین لیا۔

برصغیر پاک و ہند میں عورت ہمیشہ سے ہی گناہ، نحوست یا غیرت کی علامت بنی رہی ہے۔ ستی کی رسم، پردے کی سختی، تعلیم کی ممانعت اور بچپن میں شادیاں بی یہ سب عورت کو دبانے کے ہتھیار رہے ہیں۔ انگریز راج کے دوران تعلیم کے دروازے کھلنے لگے۔ تو سب سے زیادہ مزاحمت خود برصغیر کے مردوں نے کی۔

سرسید احمد خان، مولوی چراغ علی اور بعد ازاں علامہ اقبال جیسے مفکرین نے عورت کی تعلیم کی حمایت کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا کہ یہ تعلیم ''شرم و حیا'' کی حدود میں ہونی چاہیے۔ یہ حدود وہی ہیں جنہیں مرد طے کرتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ریاست نے جو تعلیمی و ثقافتی نظام تشکیل دیا، اس میں عورت کو ہمیشہ ماں، بیوی، یا بہن کے کردار تک محدود رکھا گیا۔ 1959 کی قومی تعلیمی پالیسی ہو یا 1979 کے دور کی ''اسلامائزیشن''۔ ہر دور میں عورت کو ''مقدس'' تو کہا گیا لیکن صرف اس شرط پر کہ وہ گھر کی چار دیواری میں رہے۔

جنرل ضیاالحق کے دور میں عورت کے خلاف ریاستی پالیسی اپنی انتہاؤں کو پہنچی۔ حدود آرڈیننس ضابطہ فوجداری میں تبدیلیاں اور پبلک اسپیس میں خواتین کی موجودگی پر قدغنیں۔ یہ سب اُس منظم تربیت کا حصہ تھے جو عورت کو خودمختاری سے محروم رکھتی ہے۔ زینب مارکیٹ سے لے کر سرکاری اسکولوں تک ہر جگہ ایک ہی پیغام دیا گیا۔ عورت کو عزت چاہیے تو گھر میں رہے۔

ٹی وی ڈرامے، فلمیں اور اشتہارات آج بھی اسی ذہنیت کے پرچارک ہیں۔ ہر بااختیار عورت کو آخر کار شکست کھاتے معافی مانگتے یا مرجاتے دکھایا جاتا ہے۔ ہر وہ لڑکی جو ''اپنی مرضی'' سے شادی کرتی ہے۔ اپنی نوکری چُنتی ہے۔ یا خاندان کے خلاف کھڑی ہوتی ہے۔ اسے آخر میں یا تو بے وفا ثابت کیا جاتا ہے یا نادم۔

ڈراموں میں ہی ہم نے بارہا دیکھا کہ عورت اگر خودمختار ہو تو وہ لازماً بدکردار ہے۔ یہ سب محض تفریح نہیں بلکہ ذہن سازی ہے۔

ہمارا درسی نصاب آج بھی ''ماں'' کو مثالی عورت کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن عقل مند، باصلاحیت لیڈر یا فیصلہ ساز عورت کو کہیں جگہ نہیں دیتا۔ اسلامیات کی کتابوں میں عورت کو ''پردہ دار'' اور ''خاموش'' دکھایا جاتا ہے۔ جبکہ مطالعہ پاکستان میں خواتین کا تذکرہ محض فاطمہ جناح یا رعنا لیاقت علی خان تک محدود ہے۔

یہ نصاب لڑکوں کو سکھاتا ہے کہ وہ ''قوام'' ہیں۔ اور لڑکیوں کو کہ وہ ''تابعدار'' رہیں۔ تعلیم کے اس نظام سے ایک ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جہاں بیٹی کی آزادی کو شرم اور بیٹے کی مار پیٹ کو غیرت سمجھا جاتا ہے۔

آئے روز ''غیرت کے نام پر قتل'' کی خبریں آتی ہیں، لیکن ان کے پیچھے وہی تربیت چھپی ہے جو عورت کی آزادی کو فحاشی قرار دیتی ہے۔ اس کی زندگی ہو یا موت۔ دونوں پر سماج نے قہقہے لگائے۔

نور مقدم کیس ہو یا ڈاکٹر خدیجہ صدیقی پر حملہ۔ یہ صرف جرائم نہیں بلکہ پیغامات ہیں: ''عورت حد میں رہے ورنہ ماردی جائے گی۔''

اسلام نے عورت کو تعلیم، تجارت، نکاح و طلاق کے حقوق دیے۔ لیکن ہمارے علماء نے ان حقوق کی تشریح اس انداز میں کی کہ عورت کو تابع کمزور اور محتاج بنا دیا۔ حضرت خدیجہؓ تجارت کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ فقیہہ اور مجتہدہ تھیں۔ لیکن ہمیں صرف یہی بتایا جاتا ہے کہ ''عورت کا اصل مقام گھر ہے۔''

علماء کی ایک بڑی تعداد آج بھی عورت کے مساوی وراثتی حقوق، نکاح میں مرضی یا عدالت جانے

CamScanner

کے حق کو "فساد" سمجھتی ہے۔ ریاست، سیاست، اور مذہب کے اس گٹھ جوڑ نے عورت کی خود مختاری کو جرم بنا دیا ہے۔

آج پاکستان کی بیٹیوں نے سوال کرنا سیکھ لیا ہے۔ "میرا جسم میری مرضی" صرف ایک نعرہ نہیں۔ بلکہ اس نظام کے خلاف بغاوت ہے جو عورت کو اس کے جسم، سوچ، فیصلے اور زندگی سے محروم رکھتا ہے۔

آج ہزاروں لڑکیاں میڈیکل، انجینئرنگ، وکالت، صحافت اور سیاست میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ وہ جاب بھی کر رہی ہیں۔ زندگی کے فیصلے بھی کر رہی ہیں۔ اور ہر اُس "غیرت" کو چیلنج کر رہی ہیں جو صرف مرد کے غصے کا دوسرا نام ہے۔

سوال ہمیں کرنا ہوگا

کیا ہم ایک ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جہاں بیٹی آزادی مانگے تو باپ اسے مار دے؟ جہاں بیوی جاب کرے تو شوہر طلاق دے؟ جہاں بہن اپنی مرضی کی شادی کرے تو بھائی اسے ذبح کر دے؟ اگر نہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ عورت کی خود مختاری کوئی جرم نہیں بلکہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔

ریاست کو چاہیے کہ وہ درسی کتابوں میں عورت کو قائد، سائنس دان، ادیب، اور لیڈر کے طور پر دکھائے۔ میڈیا کو چاہیے کہ وہ عورت کو محض قربانی کی مورت نہ دکھائے بلکہ ایک مکمل انسان کے طور پر پیش کرے۔ علماء کو چاہیے کہ وہ دین کی اصل روح کے مطابق عورت کو حق دیں نہ کہ اپنی روایات کے مطابق۔

اور سب سے بڑھ کر ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ جو عورت خود سے جینا چاہتی ہے۔ وہ فاحشہ نہیں بلکہ زندہ انسان ہے۔ وہ بغاوت نہیں کر رہی۔ بلکہ زندگی کا حق مانگ رہی ہے۔

✦✦✦

اردو ادب اور عامر بن علی

فائق احمد

اعلیٰ و ارفع ادب قوموں کی منزل کا تعین کے ساتھ ساتھ ان کا معیار بھی بلند کرتا ہے۔ ادب سے جڑت رکھنے والے ہی دراصل معمارِ قوم ہوتے ہیں۔ جو آفاقیت میں زندہ رہتے ہیں۔ نہ صرف اپنے سماج اور زمانے کو ادراک میں رکھتے ہیں بلکہ دوسرے سماج اور آنے والے زمانوں کے تقاضے اور ضرورتیں بھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ و ارفع ادب کیسا ہوتا اور اعلی و ارفع ادیب کیسا ہوتا ہے؟

بقول جمیل احمد عدیل:

"۔۔۔غوغائی لوگ، اور ان کی "ادبی آلودگی" کا نام ونشان بھی نہیں ملا کرتا۔ غبار کا نصیب گمشدگی ہے۔ علم و ادب کی دنیا میں وہی لوگ باقی رہتے ہیں جو سنجیدہ موضاعات پر سنجیدگی کے ساتھ لکھتے ہیں۔۔۔"

عہد حاضر میں ہمیں ٹیکنالوجی اور میڈیا میں ایسے کئی ادیب بلکہ "ممنوعہ ادیب" کی ایک کھیپ ملتی ہے جو غوغائی اور ادبی آلودگی کے سرخیل ہیں۔ مگر ایسے ماحول میں حقیقی ادیب اور اس کی تخلیق اپنی خوشبو بکھیرتی ہے تو سماج تازگی میں نکھرتا چلا جاتا ہے۔

پہلے بھی ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ ادب نعرہ نہیں ہے۔ اخبار نہیں ہے۔ لیکن کسی حد تک یہ دونوں قبول ہیں مگر ادب ہرگز "جگت" نہیں ہے۔ ادب کسی تماش بین کا کھیل نہیں کہ وہ اسے وقتی مسرور کرے اور وہ بھی ہلڑ بازی سے۔

ادب بُلھے نے تخلیق کیا تو رقص ہوا۔ ادب رومی نے تخلیق کیا تو دھمال ہوئی۔ میر نے تخلیق کیا تو آہ بنی۔ غالب نے تخلیق کیا تو فکر آئی۔

میرے دوستو! عامر بن علی کا ادب شاعری۔ سفر نامہ یا پھر ترجمہ کسی بھی پیمانے میں تول لیں وہ بتایا گا اپنا مول۔ اپنا اعلی و ارفع ہونا۔ دنیا کی مہذب قوم میں بسلسلہ روزگار مُقیم ہیں۔ اور جو ادب تخلیق کیا وہ بھی نہایت مہذب اور متانت سے مُزیّن ہے۔

راقم کے لیے مشکل تو بنی کہ اس مضمون میں ادب کی کون سی اصناف پر بات کرے کیونکہ عامر بن علی نے شاعری، سفر نامہ اور ترجمہ سب کے ساتھ تخلیق کے ہر پہلو سے اِنصاف کیا ہے۔

تنگیٔ وقت کے پیش نظر شاعری کے ایک پہلو پر اِکتِفا کروں گا۔

عامر بن علی نے اپنی شاعری کو ان تمام رجحانات سے سجایا ہے جو ہمیں غالب کی فکر اور فراز کی رنجش میں بھی ملتے ہیں۔ کسی بھی خیال کی بنت اور بندش کرتے عامر نے پہلے کِنائے اور اِستِعارے کو خود پر اتارا ہے اس کی رمزیّت میں ڈوب کر دیکھا ہے۔ اور پھر اسے ندرت اور جدت میں لا کر پیش کر دیا۔ اِستِعارہ قید کو توڑا دیتا ہے۔ محدود کا لامحدود کرتا کر دیتا ہے۔ معنی کو وسعت اور گردش دیتا ہے۔ مکاں اور لامکاں کی بحث سے آگے نکل جاتا ہے۔ اور ایسی طلسماتی حقیقت کی پرتیں کھولتا ہے کہ عقل وفہیم وَرطہ حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عامر بن علی کی شاعری کسی خاص علاقے یا تہذب کا پرتو نہیں بلکہ کائناتی ہے جو مشرق و مغرب کے ساجی پہلو کا ادراک رکھتی ہے۔

محبت، ہجر، عرفان اور شعور کا شاعر۔۔۔ ڈاکٹر راجا غلام اصغر طاہر

ڈاکٹر علی احمد شیرازی

ادب اور شاعری انسانی جذبات، فکر، مشاہدے اور جمالیاتی شعور کا وہ حسین امتزاج ہے جو بظاہر چند مصرعوں اور اشعار پر مشتمل ہوتا ہے مگر اس کے اندر ایک مکمل کائنات پوشیدہ ہوتی ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں جہاں کلاسیکی شعرا نے عشق و محبت، فراق و وصال، ہجر و وصال اور روحانی واردات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے، وہیں عصرِ حاضر میں بھی کچھ ایسی آوازیں ابھری ہیں جو اپنے منفرد اسلوب، تازہ لب و لہجے اور احساس کی صداقت کے ساتھ دلوں میں گھر کر جاتی ہیں۔ ان ہی باکمال شاعروں میں ایک نام ڈاکٹر راجا غلام اصغر طاہر کا ہے جن کا شعری مجموعہ ”رقصِ خوشبو“ پڑھنے والوں کے دل و دماغ میں دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

”رقصِ خوشبو“ بلا شبہ اُن کتب میں شامل ہے جنہیں صرف پڑھا نہیں جاتا بلکہ محسوس کیا جاتا ہے۔ یہ صرف اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ جذبات کی مہک، احساس کی روانی اور فکر کی لطافت کا وہ مرقع ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری الفاظ کے زیر و بم میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ہر شعر ایک الگ کیفیت، ہر صفحہ ایک مکمل داستان۔

شاعر کی زبان میں ایک خاص دلکشی، سادگی کے ساتھ گہرائی اور جذبوں کی سچائی ہے جو اس کے کلام کو عام سے ممتاز بناتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیاں جذبات کو محض لفظی خوبصورتی تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے ایک مکمل تجربہ بنا دیتا ہے۔ ان کے اشعار میں محبت کا خلوص، ہجر کی تپش، سماجی مشاہدہ، فکری سوالات اور روحانی جمال سب کچھ موجود ہے۔

ڈاکٹر راجا غلام اصغر طاہر کے کئی اشعار میں ہجر کا کرب اور یادوں کی شدت نمایاں نظر آتی ہے مگر یہ کرب محض آہ و زاری تک محدود نہیں بلکہ فکری گہرائی کے ساتھ قاری کو ایک داخلی سفر پر لے جاتا ہے:

جینے نہیں دیتی یہ مرنے نہیں دیتی
اب یاد تیری کچھ مجھے کرنے نہیں دیتی
اک کرب مسلسل ہے تیرے ہجر کی سوغات
تکلیف شب اثر بدلنے نہیں دیتی

یہ اشعار صرف محبوب کی یاد یا جدائی کے بیان تک محدود نہیں بلکہ انسان کے داخلی اضطراب اور عدم توازن کی علامت بھی ہیں۔ شاعر جذبات کو زبان دیتا ہے مگر انداز اتنا سلیقہ مند اور شفاف ہے کہ قاری کو اپنی ہی کہانی محسوس ہونے لگتی ہے۔

جذبوں کا تلاطم مجھے یکجا ہی رکھے گا
اب چاہ تیری مجھ کو بکھرنے نہیں دیتی

یہاں شاعر کا ”یکجائی“ کا تصور بھی متاثر کن ہے۔ محبت جو عام طور پر انسان کو توڑ دیتی ہے یہاں وہی جذبہ اُسے بکھرنے سے بچا رہا ہے۔ یہ زاویہ نگاہ راجا طاہر کی انفرادیت اور فکری بلوغت کا مظہر ہے۔

راجا طاہر کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو ان کی سماجی حساسیت اور حقیقت پسندانہ رویہ بھی ہے۔ وہ صرف دل کی بات نہیں کرتے بلکہ زمانے کی نبض پر بھی ہاتھ رکھتے ہیں:

فاصلے مجھ سے وہ ہر بار بڑھا دیتا ہے
بات کرتا نہیں اخبار بڑھا دیتا ہے

یہ شعر نہ صرف رشتوں کی دوری کی علامت ہے بلکہ آج کے معاشرتی رویوں پر بھی ایک لطیف طنز ہے۔ میڈیا، معلومات کی زیادتی، اور ذاتی رابطوں کی کمی کا ایک گہرا استعارہ ہے۔

رنگ یا نسل سے ہوتا نہیں انسان بلند
فقط انسان کو کردار بڑھا دیتا ہے

یہ شعر ایک مکمل فکر اور پیغام ہے۔ نسل، رنگ، زبان یا معاشرتی حیثیت سے بالاتر ہو کر انسان کا اصل جوہر کردار میں پنہاں ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جو راجا طاہر کو محض شاعر نہیں ایک باشعور اور بیدار فکر انسان ثابت کرتا ہے۔

عشق کی بات ہو اور روحانیت کا ذکر نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ راجا طاہر کے اشعار میں عارفانہ لطافت، روحانی عقیدت اور ذکرِ علی (ع) کا تاثر ایک منفرد فضا قائم کرتا ہے:

موسیٰ کی طرح ہم بھی عصا رکھتے ہیں طاہر
کہ نادِ علی بات بگڑنے نہیں دیتی

یہ شعر عشقِ علی کے تقدس، ایمان کی طاقت اور روحانی تحفظ کی خوبصورت مثال ہے۔ راجا طاہر اپنی عقیدت کو اظہار کی بلندی پر لے جا کر قاری کو متاثر کر دیتے ہیں۔

عشق کی نرم فضاؤں میں گھلتے اشعار، شاعر کے جذبوں کی پاکیزگی اور شدت کو بیان کرتے ہیں:

مجھ سے وہ ہم کلام ہو جائے
میرا مقصد تمام ہو جائے
یوں کروں میں طواف کوچہ یار
وہ گلی میرے نام ہو جائے
اس طرح ذکر یار کر طاہر
کہ معطر مشام ہو جائے

یہ اشعار عشق کے والہانہ پن، عاجزی، اور روحانی وجد کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں محبوب صرف صنفی یا رومانی شے نہیں بلکہ ایک پاکیزہ مقام رکھتا ہے، جسے چاہنے میں عبادت جیسا سرور ہے۔

شاعری میں جہاں جذبات اور فکر کی گہرائیاں ہوں وہاں کبھی کبھی ہلکی طنز کی جھلکیاں بھی لطف دے

CamScanner

جاتی ہیں:

طب کی دنیا میں ترقی کا اثر تو دیکھو
یہ وہ شعبہ ہے جو بیمار بڑھا دیتا ہے
تخت پہ بیٹھنے والا بھی عجب ہے طاہر
ہر مخالف کو سردار بڑھا دیتا ہے

یہ اشعار معاصر معاشرتی نظام پر ایک حسین طنز ہیں جو بظاہر مزاحیہ انداز رکھتے ہیں مگر اندرون میں تلخ حقیقتیں سموئے ہوئے ہیں۔

راجا غلام اصغر طاہر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ قاری کو متاثر کرتی ہے، نہ صرف عقل سے، بلکہ دل سے۔ ان کے اشعار سادہ مگر پراثر ہیں۔ ہر شعر ایک لمحہ، ایک کیفیت اور ایک منظر بن جاتا ہے جسے قاری مدتوں بھول نہیں سکتا۔

''رقصِ خوشبو'' کا مطالعہ دراصل لفظوں کے ایک ایسے باغ میں سیر ہے جہاں ہر شعر ایک پھول کی طرح کھلتا ہے اور اپنے ساتھ خوشبو بکھیرتا ہے۔ اس مجموعے میں نہ صرف شعری تکنیک کی مہارت نظر آتی ہے بلکہ جذبات کی سچائی، فکر کی وسعت اور محبت کی شدت بھی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔

ناچیز، راجا غلام اصغر طاہر کو''رقصِ خوشبو'' جیسی لطیف اور فکری شعری کاوش پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔ یہ مجموعہ محض ادب کے ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک کتاب نہیں بلکہ ایک ادبی تجربہ، ایک جمالیاتی سفر، اور ایک روحانی خوشبو ہے۔ یہ وہ تحفہ ہے جو پڑھنے والے کے دل میں ایک نرم، خوشگوار اور دیرپا مہک چھوڑ جاتا ہے۔

''رقصِ خوشبو'' بلاشبہ اردو شاعری کے افق پر ایک نئی اور روشن کرن ہے جو راجا طاہر کے فن، فکر اور محبت کے نور سے جگمگا رہی ہے۔

✦✦✦

نعت

غم ہے نہ کچھ ملال، محمدؐ کے شہر میں
رہتے ہیں خوش خصال، محمدؐ کے شہر میں
کتنے ہی خوش نصیب ہیں کتنے ہی بامراد
جو پا گئے وصال محمدؐ کے شہر میں
سرمایہ ءِ حیات ہیں واللہ مرے لیے
گزرے جو ماہ و سال محمدؐ کے شہر میں
کرتے ہیں پیش نعت کے دیوانے پھول جو
مقبول ہیں وہ تھال محمدؐ کے شہر میں
اعجاز لطف و جود سے ہم کب، کہاں نڈھال
کافی ہے اک وصال محمدؐ کے شہر میں

عبدالقیوم زائر/امریکا

ثلاثی

(معریٰ نظمیں)

ملاوٹ

ملاوٹ بھی کرے ایمان والا
خدا کو حاضر و ناظر بھی مانے
خدا کیا کہ رہا ہے یہ نہ جانے

حقوق العباد

مجھے عذر کوئی نہیں ہے قبول
سنوں گا تمہاری کوئی اس کے بعد
کرو پہلے پورے، حقوق العباد

بھیڑیے

زندوں کو نوچتے ہوئے ہر پل
جا بجا اور عام شہروں میں
بھیڑیے ہیں تمام شہروں میں

چشمہ

چشمہ بھی اب بغیر ڈوری کے
کم ہی آنکھوں پہ اب ٹھہرتا ہے
عمر کے اب ہیں ایسے حصے میں

وہ زمانے

گیا زمانے تھے وہ زمانے بھی
اب تو ڈرتا ہے باپ بچوں سے
ڈرتے تھے باپ سے کبھی بچے

تربیت

تربیت کی جائے گر اولاد کی
دوست ہوتی ہے یہ ثابت بہتریں
ورنہ جانو، جانی دشمن، بدتریں

گھر

پوچھ عاصم کرایہ داروں سے
جس کا نعم البدل نہ دنیا میں
گھر وہ عاصم بخاری دولت ہے

کالا پانی

لے گیا ساتھ رونقیں ساری
بن ترے شہر بھی ترا اب تو
''کالا پانی'' دکھائی دیتا ہے

بددعا

جا تجھے بد دعا نہیں دیتا
سربراہی نصیب ہو تجھ کو
بگڑے تگڑے کسی ادارے کی

خون

یہ حقیقت ہے میں نہ پینے میں
آنتیں پر ہی فقط نہ مرغی کے
خون بکتا ہے شہر اپنے میں

عمل

شرط پہلی عمل بخاری جی
کامیابی کسی کو بھی عاصم
گھر میں بیٹھے کبھی نہیں ملتی

عاصم بخاری/میانوالی

بقیہ انٹرویو: جی۔ اے نجم

س: کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

ج: جی میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں حصہ لینا شروع کیا پھر اس کے بعد پنجابی سنگت پاکستان۔ تو یہ دو تنظیمیں ایسی ہیں جن میں میرا اٹھنا بیٹھنا رہا اور ادبی تربیت کی سرپرستی میری یہیں سے ہوئی ہے۔ باقاعدہ تو کسی تحریک میں شامل نہیں ہوئے۔ جی اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ سیاست کے بغیر شاعری کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔ آپ کو حالات حاضرہ پر بھی نظر رکھنی چاہیئے اور جہاں آپ کو لگے کہ چیزیں ٹھیک نہیں ہو رہی، اس کے متعلق آپ کو لکھنا چاہیے۔ ضرور لکھنا چاہیے۔

س: کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج: دیکھیں میں سمجھتا ہوں کہ ہر چیز اپنے ارتقائی عمل سے گزرتی ہے۔ جوں جوں انسان آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو وہ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا کی جانب جاتا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ کتاب سے دوری ہے۔ جو لوگ کتاب پڑھتے ہیں وہ آج بھی کتاب پڑھتے ہیں۔ کتاب بینی بہت پرلطف ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا کی اپنی اہمیت ہے۔ آپ اگر نجم فیلوز کی بات کریں جو کہ ہمارا ادارہ ہے، ہم یہی کام کر رہے ہیں کہ جو بھی شاعری ہمارے پاس پرنٹ میڈیا کی صورت میں موجود ہے، ڈیجیٹلائز کیا جائے۔ جو شاعر اور شعر ہے وہ عوام تک خود پہنچے۔ کلام شاعر بہ زبان شاعر کی صورت میں پہنچے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کتاب سے دوری ہے۔ لیکن جب الیکٹرانک میڈیا پر آپ کسی کو سنتے ہیں تو آپ کا رجحان بڑھتا ہے اور آپ کا دل کرتا ہے کہ آپ مزید اس کو سنیں۔ اس کے بعد وہ یوٹیوب پر آئے ہیں اور یوٹیوب کتاب تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا کی اپنی اہمیت ہے اور کتاب کی اپنی اہمیت ہے۔

س: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج: یقیناً جب انسان سفر میں ہوتا ہے۔ زندگی میں ایسے تجربات ہوتے اور مشاہدات ہوتے ہیں۔ زندگی میں ڈی ٹریک کرنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں، حوصلہ افزائی کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تخلیقی سطح پر شروع میں مجھے بالکل بھی علم نہیں تھا کہ کوئی استاد ہوتا ہے جس سے رہنمائی لی جا سکتی ہو۔ اسے اپنا کام دکھایا جا سکے، جس سے آپ کی تخلیقی صلاحیت بڑھ سکے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو میں نے فیس کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو نئے لکھنے والے ہیں ان کو نجم فیلوز اون کرے اور ان کی آگے تخلیقات پہنچائے۔ تاکہ ان کو پتہ ہو یہ ایک ٹریک ہے اس کے اوپر رہ کر آپ نے اپنی تخلیقات پہنچانی ہیں۔ میرے ساتھ تو معاملہ ہی ایسا رہا کہ جو نئے لکھنے والے ہیں ان کو اون نہیں کیا جاتا، کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں دیا جاتا۔ ایک ذاتی تعلق کی بنا پر لوگوں کو مشاعرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ پھر مجھے لگا کہ کوئی پلیٹ فارم ایسا بھی ہو جہاں اقربا پروری نہ ہو۔ ہمیں ایک ایسا پلیٹ فارم بنانا ہے جہاں ہر کوئی آ سکے اور اپنی تخلیقات پیش کر سکے۔

س: شعر و ادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہے؟

ج: شعر و ادب کی ترویج کے لئے مشاعرے بڑے اہم ہیں۔ جو شعر سننا چاہتا ہو وہ مشاعرے میں آتا ہے اور اسکو مزید شوق پیدا ہوتا ہے۔ اب تو الیکٹرانک میڈیا نے اتنی آسانی کر دی ہے کہ آپ یوٹیوب یا سوشل میڈیا پر کسی بھی شاعر کو سن سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے بھی آسانی ہے جو کہتے تھے ہمیں کوئی پلیٹ فارم نہیں ملتا۔ سوشل میڈیا بذات خود ایک پلیٹ فارم ہے۔ آپ اپنی شاعری اس کے اوپر ڈالیں تو لوگوں تک پہنچتی ہے۔

س: نجم فیلوز کے قیام کا خیال کیسے آیا؟ ادب کی بے لوث خدمت کا یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج: 2019 میں جب میں نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا میں لوگوں کے پاس گیا ہوں تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ رابطے میں رہیں۔ ہمارے، منتظمین کی خوشامد کریں گے تو آپ مشاعروں میں شریک ہوں گے۔ تو میں نے سوچا کہ ایسا پلیٹ فارم ہو جس میں کسی بھی علاقے کو ترجیح دیئے بغیر جو بھی ادب سے متعلق ہے بغیر کسی زبان کے فرق کے جو اہل سخن ہے وہ یہاں آئے اور اپنی تخلیقات پیش کرے۔ تو اس وجہ سے یہ پلیٹ فارم بنایا گیا۔ دوسرا ادب کی بے لوث خدمت کرنے کے لئے یہ پلیٹ فارم بنایا گیا۔ جو شاعری کی شیلف لائف ہے وہ مشاعرے کی لائف کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے جناب اچھا پروگرام کروا لیا یا ہم نے ایک سال اچھے پروگرام کروا لئے۔ اس کے بعد آپ کا پروگرام پورا ہو گیا، ایسا نہیں ہے۔ آپ کو مسلسل کام کرتے رہنا چاہیئے۔ ہاں بیچ میں ایسے لوگ بھی تجربے کے طور پر آئے جن سے ہمیں سیکھنے کو بہت کچھ ملا۔ ایک شعر ہے اس حوالے سے۔

محبت یوں تو اچھی ہے، مگر نجمی کے رویے نے
ہمیں اس تجربے سے یوں گزارا کہ کچھ نہیں چھوڑا

تو بعض اوقات ایسے لوگ آپ کو ایسے تجربات دے جاتے ہیں کہ آپ کو لگتا ہے کہ سب ختم ہو گیا۔

CamScanner

میرا ذاتی طور پر خیال ہے کہ جب تک آپ کے کام سے کوئی ایک بندہ بھی مستفید ہو رہا ہو تو آپ کو جاری رکھنا چاہیے۔ بجائے اس کے جو لوگ آپ کے خلاف بات کر رہے ہیں۔ اس پر توجہ دینے کی بجائے آپ کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔

س: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج: اساتذہ کہتے ہیں کہ آپ کو مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ مطالعہ کا آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ نے کیا نہیں لکھنا۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ جب کوئی تخلیق کار اس بات کو سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کیا نہیں لکھنا؟ تخلیق کار تب پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تخلیق تب پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک نیا پن اس کے اندر تب پیدا ہوتا ہے جب اسے پتا ہو کہ اسے یہ نہیں لکھنا۔ ایک اچھے تخلیق کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس چیز کا خیال رکھے کہ جو چیزیں لکھی گئی ہیں ان میں ایک نیا انداز ہو۔ یہ انداز ہی کسی چیز کا تسمیہ بنتا ہے۔ آپ کو لگتا ہے کہ اس انداز میں اس چیز کو کسی نے پیش نہیں کیا۔ ہمیں اس چیز کا خیال رکھنا ہوگا کہ جو ہم تخلیق کرنے جا رہے ہیں اس تخلیق کا فائدہ کیا ہوگا۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ جب آپ اس کا مقصد سمجھ جاتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی تخلیق بھی پروان چڑھتی ہے۔ آپ کے اندر برکت بھی آتی ہے، چیزیں بھی بہتر ہوتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ آپ کسی کی چیز اٹھائیں اور اس پر تجربہ کریں۔ لوگ کیا کرتے ہیں کہ کسی کی چیز اٹھاتے ہیں اور اس پر تجربہ کرتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک شعر یاد آ گیا۔

کیوں چبایا نجم لقمہ غیر کا
قہقہے سے کیوں نکالا قہقہہ

ایک تخلیق کار کو خیال رکھنا چاہیے کہ اسے لائن کے اوپر لائن نہیں مارنی چاہیے۔ آپ اپنا راستہ بنائیں۔ نیا پن لائیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تخلیق بہتر ہوگی، اس میں برکت بھی ہوگی۔

س: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج: 2005 میں میں نے ہائیر پاکستان کو بطور اکاؤنٹنٹ یا ڈیٹا انٹری آپریٹر جوائن کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اپنا ACCA مکمل کیا۔ ان آٹھ سالوں میں میں نے یہ کیا کہ اس دوران جو کمایا تھا وہ سب ACCA پر لگا دیا۔ تعلیم پر زیادہ توجہ دی۔ تعلیم اور جاب ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اس کے بعد کمپنی نے مجھے اسسٹنٹ منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی۔ عموماً ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے کہ بچے ACCA کرنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ ہمیں اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ مل جائے گی، ایسا نہیں ہوتا۔ آپ کا تجربہ آپ کو آگے لے جاتا ہے۔ جتنا آپ کا تجربہ زیادہ ہوگا۔ کسی فرم کے اندر آپ کی اہمیت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ لوگ بھی اس حساب سے آپ کو پہچانیں گے۔ اگر آپ کا تجربہ نہیں ہے تو پھر چیزیں بھی اس حساب سے نہیں ہوں گی۔ آپ کو پریکٹیکل جاری رکھنا چاہئے۔ اس سے آپ پالش ہوں گے۔ آپ کے اندر بہتری آئے گی۔ سٹڈی اور جاب اگر ساتھ ساتھ کر رہے ہوں گے تو چیزیں زیادہ باریکی سے سمجھ میں آئیں گی۔

س: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج: جو بھی لکھاری ہے میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اندر ایک ٹیلنٹ رکھ کے بھیجتا ہے، چیزیں جس طرح سے آپ لیتے ہو۔ جیسے شاعر ایک حساس انسان سمجھا جاتا ہے۔ وہ معاشرے سے، اندرون سے، ہر جگہ سے سیکھتا ہے۔ سڑک پر چلتے چلتے کسی پھول کو وہ دیکھ کر رک جاتا ہے۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس کی آنکھیں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ تخلیقی طور پر اللہ نے جس کے اندر یہ جوہر رکھا ہے وہ اس سے تاثر لیتا ہے۔ وہ معاشرے سے بھی ہو سکتی ہیں، اندرون سے بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہیں۔ آپ پر کچھ بیتا ہے، وہ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کو دکھ میں دیکھ کر آپ کو برا لگتا ہے۔ پھر یہ آپ کو لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے تخلیق کار اپنے اردگرد سے تخلیق کرتا ہے اور پھر تحریر کرتا ہے۔

س: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج: ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کا بہت اہم کردار ہے۔ ہمارا سب سے بڑا پرابلم یہ ہے کہ ہم تبدیلی کو قبول نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چینج ہمیں پھر قبول نہیں کرتا۔ اور اس کھینچا تانی میں ہم بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میں اس کی مثال ایسے دوں گا کہ لاؤڈ سپیکر جب نیا نیا آیا تو مولوی حضرات نے اسے حرام قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اب اگر آپ ان کے ساتھ ملنا بھی چاہو گے تو نہیں مل سکتے۔ ایسے ہی جب سوشل میڈیا آیا تو ہمارے کچھ دوستوں نے دیکھا کہ یہ اچھا پلیٹ فارم ہے تو کچھ نے اس سے بہت کچھ اڈوپٹ کیا تو کچھ نے اسے حرام قرار دیا کہ کیا فضول یہ ٹک ٹوک ہے، کیا یہ فیس بک ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب آہستہ آہستہ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔ اب اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کہ اگر کسی پلیٹ فارم پر کوئی حقیقی تخلیق کار بندہ موجود نہیں ہے تو غیر تخلیق کار بندے اس کو ہائی جیک کر لیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ فنکار بندے آگے آئیں۔ سوشل میڈیا کی اہمیت کو سمجھیں اور یہاں اپنے قدم مضبوط کریں۔ پہلے ہم نے دیکھا کہ سوشل میڈیا پر بے معنی سی شاعری چلتی رہی ہے۔ کئی اور طرح کے الفاظ کہے جا سکتے ہیں اس کے لئے۔ نتیجہ کیا ہوا کہ جب جینوئن شاعر آنا شروع ہوئے تو لوگوں نے اس کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں سوشل میڈیا بہت ضروری ہے۔ اب آ رہی

ہے AI ٹیکنالوجی (مصنوعی ذہانت)۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ابھی سے AI ٹیکنالوجی کے بارے میں سیکھنا چاہیے کہ کیسے ہم اس کو استعمال میں لا کر ادب کے فروغ کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی نئی ٹیکنالوجی آئے آپ اس کو جلد سے جلد اپنی زندگی میں شامل کریں تاکہ آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج شاعر بہت حساس انسان ہوتا ہے۔ جب اس کو اندر سے دوسروں کا دکھ، اپنا دکھ، کوئی خوشی نظر آتی ہے۔ کوئی محبت کے جذبات، یہ سارے جذبات، کیفیات جو اس کے سامنے ہوتی ہیں تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب وہ متاثر ہوتا ہے تو ان کو لفظوں کی شکل دیتا ہے۔ وہ لفظوں کی شکل تخلیق کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارے تجربات، مشاہدات بنیاد بنتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی ایک لمبی تاریخ ہے بعض اوقات کئی لوگوں کا مشاہدہ ایک جیسا بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی کوئی حساس بندہ آیا ہو۔ جس طرح آپ لکھ رہے ہیں، وہ بھی اسی طرح لکھے۔ اتنی تعداد میں اور اتنی دیر سے لوگ لکھ رہے ہیں تو آپ کو ان سے ذرا ہٹ کے لکھنا ہے۔ مختلف انداز میں لکھنا ہے۔ تاکہ آپ کی تخلیق ذرا مختلف ہو، اس میں برکت پڑے اور اسکی پذیرائی ہو۔ تخلیق کا حق اس وقت ادا ہوتا ہے جب کوئی بھی عام آدمی اس کے اوپر کوئی بھی سچوایشن ہو اسکو یوں لگے کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ اس کے لئے فٹ ہے۔ تو یہ آپ کی تخلیق کے لئے ایوارڈ سمجھ لیں۔ یہ آپ کا معاوضہ ہے کہ جب کوئی بھی بندہ اپنی سچوایشن کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو اور آپ کا شعر سامنے آ گیا ہے تو وہ اس کو اپنے ہی الفاظ سمجھ لے، تو آپ کی تخلیق کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج یہ بڑا اہم سوال ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ ہم بیٹھ کر ویلوایشن کرتے ہیں کہ جو میں کام کر رہا ہوں اس کا آخر کار مجھے کیا فائدہ ہوا، کیا نقصان ہوا؟ تو معاملہ یہ ہے کہ میں اقبال نگر، میاں چنوں جیسے علاقے میں تھا، تخلیق کار، شاعر وہاں موجود تھے، لیکن ان تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ جب لاہور آیا۔ لوگوں نے بے پناہ محبتیں دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نجم فیلوز نے جو چار سال کام کیا ہے میرا کام ریفرنس کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جب لوگ آپ کو کاپی کر رہے ہوتے ہیں۔ آئیڈیاز کاپی کر رہے ہیں۔ جتنی عزت مجھے چار سال میں ملی۔ لوگ چالیس چالیس سال لگا دیتے ہیں لیکن ان کو اس طرح پذیرائی نہیں ملتی۔ الحمدللہ کہیں پر بھی جاتے ہیں تو نجم فیلوز حوالے کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ لوگ اس وجہ سے بہت عزت کرتے ہیں کہ میں نجم فیلوز کا پلیٹ فارم چلا رہا ہوں۔ بہت سے نوجوان ملتے ہیں جن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نجم فیلوز کا پلیٹ فارم استعمال کریں۔

س آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

ج ہم نے اس سے پہلے نجم فیلوز میں مختلف سلسلے چلائے ہوئے تھے۔ میں نے نجم فیلوز کا آغاز پانچ سال پہلے کیا تھا۔ پہلے دو سال میں اس کو گھر سے چلاتا رہا ہوں۔ پھر میں نے باقاعدہ سٹوڈیو بنایا تا کہ لوگوں کو آنے جانے میں آسانی ہو۔ ہم نے مختلف سلسلے یہاں پر اعتراف فن بنائی۔ اس کے علاوہ ہم نے نجم آرائی رکھی۔ ہم نے نجم نو کیا، تو یہ سارے سلسلے کئے۔ اگر فکشن کی طرف جائیں تو ہم نے کہانی پور کے نام سے پروگرام کیا۔ جس میں ہم نے مختلف کہانیاں ریکارڈ کیں۔ فلسفے کے اوپر ہم نے انٹرویوز اور لیکچرز ریکارڈ کئے۔ یہ سارا سلسلہ چلتا رہا ہے۔ اب آگے سٹوڈیو کو تھوڑا سا اپ گریڈ کر رہے ہیں۔ جس میں پروگرام کی طرز پر ہم دو تین دوستوں کو بلائیں گے۔ ان کے انٹرویوز کریں گے۔ ان سے بات چیت کریں گے۔ کوئی مخصوص موضوع ہے مثلاً ہم فلسفے کی بات کرتے ہیں۔ فلسفے کے اساتذہ کو زحمت دیں گے۔ ان سے بات کریں گے۔ ان سے فلسفے کے متعلق سیکھیں گے۔ آرٹ اور لٹریچر کی جتنی بھی جہات ہیں ان سے وابستگان کو ہم بلائیں گے۔ بلا کر ان سے بات چیت کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم پوڈ کاسٹ کا سلسلہ بھی شروع کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے نشستیں تو ویسے کی ویسے ہی چلتی رہیں گی۔ کسی بھی ادارے کو روشناس کرانے میں نشستیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ لوگ شعر بڑی تعداد میں دیکھتے اور سنتے ہیں۔ اور سوشل میڈیا پر اس کو پسند بھی کرتے ہیں۔ آرٹ اور لٹریچر سوشل میڈیا پر شاعر اور پھر کتاب کا سفر ہوتا ہے۔ اسی طرح شاعری کسی بھی پلیٹ فارم کو متعارف کرواتی ہے۔ پھر آرٹ اور لٹریچر کی جو جہات ہیں آہستہ آہستہ لوگوں کو اس کی طرف لایا جاتا ہے۔ جس طرح کی کسی کی دلچسپی ہوتی ہے، اس طرح کے سامعین آپ کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم نجم فیلوز کو ری ڈیزائن کر کے اس میں نئے فیچرز شامل کریں گے۔ پہلے جب ہم نے نجم فیلوز بنایا اس وقت یہ واحد سٹوڈیو تھا جو آرٹ اور لٹریچر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ پھر لوگوں نے شاعری کے اوپر سیٹ اپ بنا کر کام شروع کر دیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ لوگوں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ ہمارا کچھ برڈن ان کی طرف شفٹ ہوا۔ اب ہماری کچھ اور جہات ہیں جس پر اب ہم کام کریں گے۔ ادب کے حوالے سے یوں کہہ لیں کہ تھوڑا سا وقفہ دیا ہے۔ میں نے اپنی آپ بیتی بھی شروع کی تھی وہ بھی اب دوبارہ لکھنی شروع کرنے کا ارادہ ہے اور شاعری تو مزاج کے ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔

✦✦✦

CamScanner

کھلتی دھوپ اُجلتے سائے

اسد محمد خاں

میں کہانی کار ہوں، وقائع نگار نہیں۔ اگر ہوتا تو اُس دربار کے دن، سوادِ بنگالہ کے مقام سلطان پور میں خود کو موجود پاتا اور جو دیکھتا اور سنتا وہ اس طور لکھتا:

''کہ در عہد بادشاہِ عادل، شیر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ، در تاریخ نہصد چہل...... (یعنی نو سو چالیس ہجری، مطابق ۱۵۳۳ء) (گویا آج سے کوئی چار سو بہتر برس پہلے) میں جو دیکھتا ہوں، وہی درج کرتا ہوں۔''

اما بعد! میں سلطان شیر شاہ کو اپنی رعیت اور شاہی عمال کے بیچ مسندِ عدل پر بیٹھے دربار کرتے دیکھتا ہوں۔

میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ، فریادیں سنتے ہوئے موقعے پر ہی احکام صادر فرما رہے ہیں۔ دیگر یہ کہ معمول کے مطابق فریادوں کی شنوائی میں ایک پہر لگ جاتا ہے۔ مگر اس دن جلد ہی فرصت ہوگئی کہ زیادہ تعداد میں درخواستیں پیش نہ ہوئی تھیں۔

دو تین معمولی قضیے تھے جنہیں باہم رضامندی سے یا سلطانی فیصلے کے تحت نمٹا دیا گیا۔ چار معاملات ایسے تھے کہ جو قضیے ہی نہ تھے۔ فریادی فرسنگوں سے چل کر صرف اپنے سلطان کے درشن کرنے آئے تھے۔

تو اُن نام نہاد فریادیوں نے اپنے معاملات پیش کیے۔ اس دوران وہ کمال عقیدت اور مہر و مروت سے سلطان شیر شاہ کو دیکھتے رہے۔ بادشاہ نے جو کچھ فرمایا وہ انہوں نے سنا تو سہی۔ یہ خدا معلوم سمجھا بھی یا کہ یونہی اثبات میں سر ہلا ہلا کے خوش ہولیے اور دعائیں دیتے ہجوم میں جا شامل ہوئے۔

خود سلطانِ عادل اور اکثر درباری امراء ان لوگوں کی کیفیت کو سمجھتے ہیں اور ان کی قدر بھی کرتے ہیں۔ تاہم یہ مسئلہ اپنی جگہ ہے کہ ان باتوں میں دربار کا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ دربار کے بعد سوادِ بنگالہ سے آئے زمیں داران عمدہ اور خاصانِ مملکت کے ساتھ بادشاہ ناشتے پر دربار بیٹھے۔ ناشتہ معمول کے مطابق سادہ تھا۔ مرغن اور بہت میٹھی غذاؤں سے سلطان اور ان کے امراء دور رہتے ہیں۔ تاہم، وہ پھلوں اور شہد سے تیار کی ہوئی علاقہ روہ کی بعض روایتی اشیاء پسند کرتے ہیں جو اس وقت بھی مہیا تھیں۔

آج ناشتے میں برہمنوں کی ایک جماعت شریک ہوئی۔ وہ لوگ سب کے ساتھ ہی دسترخوان پر آ بیٹھے۔ ان کا لحاظ کرتے ہوئے مطبخ کے اہل کاروں کو ہدایت کردی گئی تھی کہ ہر قسم کا گوشت، مچھلی اور وہ کھانے جن میں لہسن کا استعمال ہوا ہو دسترخوان پر نہ لائے جائیں۔ ویسے بھی سب کو علم تھا کہ یہ آنے والے اپنے دین دھرم کے پابند، اصل نسل برہمن ہیں۔ ایک نوع کی کشادہ دلی، دُنیوی تعلیم اور امورِ مملکت کی سوجھ بوجھ نے انہیں بادشاہ کے قریب کردیا ہے۔

عوام الناس ایسوں کو ''شیر خانی برہمن'' کہہ کے بلاتے ہیں۔ یہ عُرف کسی طعنے کے طور پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ انہی برہمنوں نے خود کو ایسا کہلانا شروع کیا تھا۔ سو مقبولِ عوام ہوا۔ تاہم محض اس بنا پر کہ وہ خود کو ''شیر خانی برہمن'' کہلاتے ہیں، انہیں مراعات کا حقدار نہیں گردانا جاتا۔ دوسری رعیت کی طرح یہ اپنے حق اور کام کی نسبت ہی سے شاہی مراعات یا خوش نودی یا عتاب کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔

ناشتے کے بعد ایک خوش گلو ''شیر خانی برہمن'' نے ہندوی زبان کے مستند شاعروں، کتھا کاروں کی وضع پر اپنا لکھا ایک 'بارہ ماسہ' سنایا جس میں بادشاہ کے انصاف کا بیان تھا اور شیر شاہ سوری کو راجا ہریش چندرا جیسا معدلت گستر اور سچ کی پہچان رکھنے والا حکمراں گردانا گیا تھا۔

وہ برہمن اپنا 'بارہ ماسہ' سنا کر بیٹھا ہی تھا کہ بادشاہ حاضرین سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا کہ یہ نوجوان اچھا شاعر بن سکتا ہے۔ نوجوان نے سرو قد کھڑے ہو کر تسلیمات کی تو انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فرمایا ''صاحبو! یہ نوجوان اچھا شاعر بن سکتا ہے اگر شاہوں، سلطانوں سے دور رہے۔''

مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ شیر شاہ نے یہ بات مسکرا کر کہی تھی۔ مگر وہ لوگ خواص میں سے تھے، سلطان کے مزاج آشنا تھے، جانتے تھے کہ انہیں ہر قسم کی قصیدہ خوانی ناپسند ہے۔ نوجوان کے بارے میں جو کہا گیا بطور تنبیہ کہا گیا ہے۔

مجلس میں ایک طرف بیٹھا ایک بزرگ صورت برہمن دست بستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا ''مہی پال سوریہ! یہ میرا بھتیجا برسوں سے آرزو کرتا تھا کہ دربار میں پیش ہوگا تو اپنی کبت حضور کے گوش گزار کرے گا۔ یہ بارہ ماسہ اس بھاگیہ وان نے مہینوں پہلے سے لکھ رکھا تھا۔ بھلے نصیب اس کے کہ چند ماہ پہلے پر یکشا دے کے بیٹھا تھا تو اب علاقہ بنارس میں نائب امین مقرر ہوا ہے اور حضور کے اقبال کو دعائیں دیتا ہے۔

مہاراج! ادھیراج! سچ پوچھیے تو اس نے کبت سنا کے اپنی مدت کی آرزو پوری کی ہے۔

سلطان نے پوری توجہ سے بوڑھے برہمن کی بات سنی، مسکرائے، فرمانے لگے ''درست اس نوعمری میں نائب امین مقرر ہونے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ نوجوان لائق اور محنتی ہے۔ سو میری طرف سے اسے شِق بنارس میں چہار صد بیگہ زمین مزروعہ انعام دی جاتی ہے۔ اس شرط پر کہ یہ دو برس ختم ہونے سے پہلے راجا ہریش چندرا پر اچھی، پرتاثیر اور سچی کتاب لکھ کردے گا۔''

نوجوان نے اور اس کے چچا نے فرطِ مسرت میں ہاتھ باندھے اور سر جھکا دیے۔

بادشاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ بات آگے بڑھائی۔ فرمایا ''اگر ایسی کتاب نہ لکھی گئی تو دو برس پورے ہوئے پر، عطا کی گئی زمین چہار صد بیگہ سے گھٹا کر دو صد بیگہ کردی جائے گی۔ تاہم، اس کی نائب امینی برقرار رہے گی۔ یہ اس کی آزمودہ لیاقت ہے کہ امتحان دے کر اس منصب پر آیا ہے۔'' پہلے نوجوان نے پھر چچا نے کورنش گزاری۔

سلطان نے حاضرینِ مجلس کو یاد دلایا کہ راجا ہریش چندرا، جن کے ہم پلہ اس لڑکے نے اپنے سلطان کو بتایا ہے۔ بڑے بادشاہ اور اعلیٰ انسان ہوں گے۔ در آں حالیکہ میں، شیر شاہ، ایک سادہ سپاہی ہوں جسے مشیت نے مسند اور تلوار دے کر بندگانِ خدا کے معاملات سرانجام دینے پر مامور کیا ہے۔'' آگے فرمایا ''صاحبو! دعا کرو تو اپنے اپنے طریق پر فرید خان شیر شاہ سوری کے لیے بھی دعا کرنا۔ اب تمہیں اجازت ہے، جاؤ۔''

پھر شاعر کو مخاطب کیا کہ فرزند! جیتے رہے تو دو برس بعد یہیں ملاقات ہوگی۔ راجا ہریش چندرا کی کتاب اپنے ساتھ لانا۔

بوڑھے برہمن اور اس کے بھتیجے نے کورنش دی اور ایک آواز ہو کے کہا ''تتھاس تو! تتھاس تو!'' سلطانِ عادل نے فرمایا ''انشاءاللہ''

محبت کے رنگ

سیما پیروز/لاہور

محبت کی یہ کہانی تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ ساڑھے تین سال کی ایک بچی جوان سال باپ اور ادھیڑ عمر ملازم۔ دو کردار تو کب کے اگلے جہان سدھار چکے۔ وہ بچی ستر سالہ بوڑھی عورت کی صورت میں زندہ سلامت ہے۔ گزرے زمانے کو یاد کر کے آہیں بھرا کرتی ہے۔ ''ہائے کیا سادگی کا زمانہ تھا! آج کل کیسا خود غرض، بے مروّت اور آپا دھاپی کا زمانہ ہے۔ وہ بچی، کھری اور اچھوتی محبتیں نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں۔ اب تو ہر جذبہ کاروباری جنس بن چکا ہے۔'' وہ خود اگر محبت کی اس تکون کا کردار نہ ہوتی تو سمجھتی کہ شاید وہ محبتیں بھی قصہ کہانی ہوں گی۔

تعبیر (بچی) کے والد محسن علی شاہ نارووال کی مشہور درگاہ کے سجادہ نشین احسن شاہ کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ محسن شاہ کی عادات و اطوار اور تمام شوق گھر والوں سے نرالے تھے۔ کتے پالنے کا شوق، میوزک کا رسیا، شعر و شاعری اور ادب کا اعلیٰ ذوق دنیا بھر کا کلاسیک ادب اس نے پڑھ رکھا تھا۔ احسن شاہ بیٹے کی حرکتوں کی وجہ سے کافی پریشان اور نالاں رہتے تھے۔ ہزار بار اسے کبھی ڈانٹ سے کبھی پیار سے سمجھا چکے تھے۔

''کتے جیسے نجس اور ناپاک جانور کو گود میں اُٹھائے پھرتے ہو۔ جانتے ہو جس گھر میں کتا ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ گانا سننا اور تمام قسم کے آلات مضامیر سوائے دَف کے سب حرام ہیں۔'' وہ سر جھکائے ڈانٹ کھائے جاتا لیکن ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اُڑا دیتا۔ اس کی خاموشی پر ڈانٹ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔

''اوڈوں کے ڈیروں پر کیا کرنے جاتے ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی۔ اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے ہو۔ گانا بجانا کرتے ہو۔ بے شرم تمہیں اپنے خاندان کی عزت کا بھی کوئی خیال نہیں۔ جانے کتنے روپے اُن پر لٹاتے ہو اور بدلے میں کیا لاتے ہو ایک ناپاک جانور۔ تف ہے تجھ پر۔''

ماں کو بھی محسن کی وجہ سے کافی جھاڑ پڑتی۔

''تمہارے لاڈ پیار نے اسے دو کوڑی کا بنا دیا ہے۔ لچے اور شہدوں والے شوق ہیں اس کے۔ سادات کا نام ڈبو رہا ہے تمہارا یہ سپوت۔ اسے تو مراثیوں، بھانڈوں اور اوڈوں کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہ ان واہیات مشاغل سے باز نہ آیا تو میں اسے عاق کر کے گھر سے نکال دوں گا۔'' شاہ صاحب نے دھمکی دی۔

والد صاحب اسے گھر سے کیا نکالتے۔ محسن چوڑی گروں کی بیٹی پر ایسا عاشق ہوا کہ سب عیش و آرام چھوڑ کر اسے لے بھاگا۔ سیّدوں اور چوڑی گروں نے جگہ جگہ کی خاک چھان ماری۔ عشق کے متوالوں کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔ پانچ سال چھپتے چھپاتے شہر شہر گھومتے ہنسوں کے جوڑے نے آخر کار کلانور ضلع گورداسپور میں ڈیرے لگا لیے۔ محسن جب گھر سے بھاگا تو ماں نے بہت سارا روپیہ اور گہنے دیے تھے۔ کیونکہ وہ ماں کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا۔

کلانور میں زرعی زمین خرید لی۔ یوں زندگی سکھ چین سے گزرنے لگی۔ شادی کے چھٹے سال اللہ تعالیٰ نے بیٹی سے نوازا جس کا نام تعبیر رکھا گیا۔ بچی ہو بہو ماں کی تصویر تھی۔ گوری رنگت موٹی موٹی بلوریں آنکھیں۔ جو بھی دیکھتا اسے پیار کیے بنا نہ رہتا۔

اگرچہ محسن شاہ کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر کے بعد دو بیٹوں سے نوازا تھا لیکن جو محبت تعبیر کے حصے میں آئی اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

زندگی میں ذرا سکون ملا تو محسن شاہ کے پرانے شوق عود کر آئے۔ میوزک اور گانے کی محفل جمانا، کتے پالنا اور پکھی واسوں کے ڈیرے پر جانا۔ وہ جیسے ہی سنتا کہ شہر کے ارد گرد کہیں پکھی واسوں کا ڈیرا اُترا ہے تو ان کے ہاں جا پہنچتا۔ ان کی دعوتیں کرتا، انھیں تحفے تحائف دیتا۔

دھیرے دھیرے لوگوں کو نہ جانے کیسے معلوم ہو گیا کہ محسن شاہ بڑی کرامات والے گدی نشینوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو لوگ دم، تعویذ اور دعا کے لیے آنے لگے۔ اگرچہ محسن یہ سب پسند نہیں کرتا تھا اور لوگوں کو منع بھی کرتا تھا۔ بعض اوقات تھوڑا تلخ بھی ہو جاتا لیکن لوگ بھی عجیب اندھی عقیدت کے شیرے میں لتھڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ مکھی کی طرح جتنا اُڑاؤ دوبارہ آ کر بیٹھ جاتی ہے۔

''شاہ جی! آپ کیوں لوگوں سے اس طرح تلخ لہجے میں بات کرتے ہیں۔'' مہرالنساء نے سمجھایا۔

''کیا کروں؟ جن زنجیروں کو میں توڑ کر بھاگا تھا یہ لوگ انہی میں دوبارہ جکڑنا چاہتے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''دیکھو شاہ جی! آپ کا کیا جاتا ہے۔ آپ اللہ سے دعا ہی کرتے ہو نا یا پھر اللہ کا کلام پڑھنے کو بتاتے ہو۔ اگر اُن کے کام ہو جاتے ہیں تو آنے دو بیچاروں کو۔ یہ ایک طرح کا صدقہ جاریہ ہے۔''

''کمال کرتی ہو...... یہ سب جہالت ہے۔ یہ خود

بھی پروردگار سے مانگیں تو انشاءاللہ وہ دے گا۔"

محسن شاہ اُن سے ایک پیسہ نذرانے کے طور پر وصول نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی کچھ دینے کی کوشش کرتا تو اُٹھا کر پھینک دیتا اور نذرانہ دینے والے کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کرتا۔ عشاء کی نماز کے بعد دوستوں کی محفل جمتی۔ محسن ہارمونیم بہت اچھا بجاتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی صوفیانہ کلام بھی گاتا تھا۔ پہلے صرف شوقیہ گانے والے دوست احباب ہی گاتے تھے۔ پھر کچھ باقاعدہ گانے والے بھی آنے لگے۔ طبلے کی سنگت کے لیے دھاریوال کا ایک ادھیڑ عمر آدمی خدا بخش نہ جانے کیسے چلا آیا۔ جوان بچوں کا باپ تھا بیوی فوت ہو چکی تھی۔ غالباً بہو بیٹیوں سے ناراض ہو کر آیا تھا۔

تعبیر چند ماہ کی تھی جب وہ آیا تھا اور پھر جیسے وہ گھر کا فرد ہی بن گیا۔ خدا بخش طبلہ ایسا ڈوب کر بجاتا تھا کہ حاضرین محفل وجد میں آ جاتے تھے۔ اس کے ذمے کوئی خاص کام نہیں تھے۔ باہر والی بیٹھک میں جو لوگ آتے ان کے چائے پانی کا خیال رکھنا، سودا سلف لانا اور کتوں کی نگرانی۔ اُن کی خوراک کا خیال رکھنا اور صحت کا دھیان رکھنا اور نوکروں سے انھیں نہلوانا وغیرہ۔

سب سے بڑھ کر ننھی تعبیر میں تو اس کی جان تھی۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر سارا دن تعبیر کو گود لیے لیے پھرتا۔ ماسی بختو تعبیر کو نہلا دھلا کر تیار کر کے خدا بخش کو پکڑا دیتی۔ پھر اسے کھلانا پلانا، بال بنانا سب کام وہی کرتا۔ تعبیر کے اوپر تلے دو بھائی بھی آ گئے۔ مہرالنساء بیٹوں کے ساتھ مصروف ہو گئی تو تعبیر بالکل ہی خدا بخش کے حوالے ہو گئی۔ مگر گرمیوں کی شاموں میں اور سردیوں کی دھوپ میں عموماً صحن میں چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ خدا بخش ننھی تعبیر کو چارپائی پر بٹھا کر اس کے ساتھ کھیلتا رہتا اور توتلی زبان میں اس سے باتیں کرتا رہتا۔ تعبیر نے بولنا سیکھا تو سب سے پہلے "پاء بسا" کہا۔ خدا بخش کی خوشی دیدنی تھی۔ ایک ایک کو بتا رہا تھا۔ "تعبیر نے میرا نام لیا ہے۔" اس دن سے خدا بخش کا نام پاء بسا ہو گیا۔

تعبیر کے بال بہت گھنے، سلکی اور سیدھے تھے۔ کانوں سے ذرا نیچے تک کٹے ہوئے تھے۔ پاء بسا تعبیر کو "پاءٹو" کہتا۔ خدا جانے کس زبان کا لفظ تھا یا اس کا اپنا ہی ایجاد کردہ تھا۔ تعبیر نے بولنا شروع کیا تو وہ اپنے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کرتی۔ سارا وقت آوازیں آتی رہتیں۔

"پاءٹو! تم لڑکی ہو یا لڑکا" وہ جھٹ جواب دیتی "لڑکا"

"تم بے بے ہو کہ بابا" تعبیر کھل کھل ہنستی جاتی اور دہرائے جاتی "میں بابا ہوں"

"تم چڑیا ہو یا چڑا؟" سوال آتا۔ کھٹ جواب آتا "چڑا"

وہ فخر سے گردن پھلا کر جب اپنے لیے مذکر لفظ بولتی تو پاء بسا ہنسی سے دہرا ہو جاتا۔ وہ جب سے آیا تھا نہ کسی تنخواہ کی بات کی نہ معاوضے کی۔ محسن شاہ اپنے جیسے اس کے کپڑے بنواتا۔ ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتا، کبھی محسن یا مہرالنساء خاموشی سے اس کی واسکٹ کی جیب میں پیسے ڈال چھوڑتے۔ اُن میں سے زیادہ تر پاءٹو پر خرچ کر چھوڑتا۔ جب بھی بازار سے واپس آتا کبھی اس کے لیے کھلونے، بالوں کی پنیں، کلپ، پھل فروٹ اور قلاقند خاص طور پر اس کے لیے لے کر آتا اور اسے ہی کھلاتا۔ دوسروں کو ہوا تک نہ لگنے دیتا۔ ایسی الوہی محبت دیکھی نہ کبھی سنی۔ کبھی کبھار مہرالنساء محسن سے کہتی "شاہ جی! اگر کبھی پاء بسا اپنے بیٹوں کے پاس چلا گیا تو تعبیر کا کیا ہو گا؟"

"کہیں نہیں جاتا۔ کتنی بار بہو بیٹے لینے آئے ہیں۔ ابھی تک تو گیا نہیں اور ہمیں چھوڑ کر وہ کیوں جائے گا؟ وہ ہمارے گھر کا فرد ہے۔ ہمارا بزرگ ہے۔"

"شاہ جی! اپنی زمینوں کے پاس انہی اوڈوں کا ڈیرا اُترا ہے۔ جن کا بچہ آپ کی دعا سے تندرست ہو گیا تھا۔" خدا بخش ایک روز خبر لایا۔

"اچھا......" محسن کے لہجے میں جیسے خوشی کی لہر سی تھی۔

مہرالنساء نے برا منایا "پاء بسے! آپ کو کتنی بار کہا ہے انھیں مت بتایا کرو۔ ان کو تو پھر گھر والے بھی بھول جاتے ہیں۔ شاہ جی! آپ کی روح تو شاید اللہ تعالیٰ نے پکھی واسوں کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔"

"خفا کیوں ہوتی ہو۔ اس بار تمھیں بھی لے کر چلوں گا۔ اس قدر سادہ لوح اور بےلوث لوگ ہوتے ہیں فطرت کے قریب۔ انھیں مل کر بڑا سکون ملتا ہے۔"

"لے آئیں گے وہاں سے پھر کوئی کتا۔ پہلے ہی لوگ آپ کو شاہ کتیاں والا کہتے ہیں۔ آپ کو برا نہیں لگتا؟" مہرالنساء شرارت کے موڈ میں تھی۔

"برا کیوں لگے گا؟ کتے پالنا میرا شوق ہے اس میں برائی کیا ہے؟"

محسن ابھی جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی ملنے چلا آیا۔

"میں تو خود تمہاری طرف آنے والا تھا۔" محسن انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"نہ شاہ جی! تسی تے اساں دے پیر و مرشد او۔ ساڈا بچہ ول کر کے تساں تے اساں کوں خرید لیا اے۔"

"جندوڈا...... ایسی بات نہیں کہتے۔ شفا دینے والا رب کریم ہے۔ میں تو اس کا ایک گنہگار بندہ ہوں۔"

"شاہ جی! میری بیوی نوں بی بی ہوراں نوں ملنے داوڈا شوق اے۔ ایس کر کے ایہہ وی میرے نال آئی اے۔"

"خدا بخش جاؤ بچوں کو اندر زنان خانے میں لے جاؤ۔"

"سلام بی بی جی۔" نوری مہرالنساء کے پاؤں چھونے جھکی تو اس نے فوراً اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھالیا۔

"نہ بی بی مینوں گنہگار نہ کرو۔ تسی سید اسی کی کمین۔ تہاڈے پیراں دی خاک۔ میں تساں دے برابر کیویں بیٹھ سکنی آں" وہ فوراً زمین پر بیٹھ گئی۔ مہرالنساء نے دوبارہ نوری کو پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا۔

"ایسے نہیں بولتے۔ اللہ تعالیٰ نے سب انسان برابر بنائے ہیں۔" خوشی سے نوری کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اپنے حساب سے نوری مہرالنساء کے لیے بہت سارے تحفے لے کر آئی تھی۔ ناڑ کی بنی ہوئی خوبصورت رنگ برنگی شیشے جڑی چنگیریں، پنکھیاں، پراندے اور تعبیر کے لیے کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں۔

محسن شاہ نے ان کی بہت خاطر مدارت کی۔ جاتے جاتے وہ محسن کو دعوت دے گئے کچھ دنوں کے بعد محسن شاہ، پابسا، تعبیر اور دو ملازمین کے ساتھ بہت سارے تحائف لے کر پکھی واسوں کے ڈیرے پہنچا۔

اپنے پیر و مرشد کو اپنے درمیان دیکھ کر وہ بیچارے اس قدر خوش تھے کہ انھیں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ پیر صاحب کی پذیرائی کیسے کریں؟ اپنی طرف سے انھوں نے خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سالم بکرا روسٹ کیا اور گرم گرم تنور کی روٹی کے ساتھ پیش کیا۔

جاتے ہی محسن شاہ کی توجہ ایک کتورے نے کھینچ لی۔ کھانا کھاتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے اس کا دھیان اس پپی کی طرف رہا۔ وہ گدی نسل کا تھا جو رکھوالی کے لیے اور شکار کے لیے بہترین ہوتے ہیں۔ چلتے وقت انھوں نے ایک گھوڑی نذر کی۔

"جندوڈا! تم جانتے ہو میں نذرانے وغیرہ نہیں لیتا۔"

"شاہ جی! ایہہ گھوڑی اساں چھوٹی بی بی دی نذر کیتی اے۔ اوہ پہلی وار ساڈے ڈیرے تے پدھارے نیں۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔ آؤ پہلے تمہارے ڈیرے کے باقی لوگوں سے بھی ملاقات کرتے ہیں۔"

محسن نے تعبیر کے کان میں چپکے سے یہ بات ڈال دی کہ چلتے وقت تم نے وہ والا پپی مانگنا ہے۔

چلتے سے محسن شاہ نے کہا "بھئی یہ گھوڑی تو آپ رکھیں۔ بی بی کو تمہارا یہ کتورا بہت پسند آ گیا ہے۔"

"نہیں شاہ جی! ایہہ میں نہیں دے سکدا۔ تساں نوں انکار کر کے میں بوہت شرمسار آں۔ پر سائیں ساڈے ڈیرے تے اس نسل دا ایہہ اکو ای کتورا بچیا اے۔ ماں ایدی اینوں جنم دے کے مر گئی۔ پیو گڈی تھلے آ گیا۔ دو کتورے ہور وی سن پر او بنا ماں دے زندہ نہ رہے۔ شاہ جی تہاڈے واسطے میری جان وی حاضر اے کجھ ہور حکم کرو سرکار۔" جندوڈا ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

محسن کے اشارے پر تعبیر نے ایک ہی رٹ لگا دی "مجھے تو یہ پپی ہی لینا ہے۔"

وہ بیچارے اس کو اور کتے، گھوڑے، بکریاں اور مرغیاں پیش کرتے رہے تعبیر ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔

"چلو جندوڈا جانے دو۔ بچی ہے بہل جائے گی۔ ہم اب چلتے ہیں۔ تمھاری مہمان نوازی کا بہت شکریہ۔"

"نہیں شاہ جی! بی بی نوں خالی ہتھ کیویں بھیج دیاں۔" آخر کار وہ پپی محسن شاہ کے ساتھ آیا۔

محسن شاہ کی خوشی دیکھ کر مہرالنساء چڑ کر بولی "آپ شاید اپنی اولاد کے پیدا ہونے پر اتنے خوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ لوگ سچ ہی آپ کو کتوں والا شاہ کہتے ہیں۔" محسن شاہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا "پگلی"

دسمبر کی اس دوپہر صحن کے آخری کونے میں چاروں کتے بندھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک نیا کتا گل جنگ نہایت خونخوار تھا۔ اسے دوسرے کتوں سے بھی ذرا فاصلے پر باندھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ انھیں بھی بھنبھوڑنے کو پڑتا تھا۔ خدا بخش بھی تھوڑے فاصلے پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ محسن شاہ نے دھوپ میں مصلیٰ بچھایا اور ظہر کی نیت باندھنے سے پہلے خدا بخش کو تاکید کی "چھوٹے پپی کا دھیان رکھنا وہ گل جنگ کی طرف نہ چلا جائے۔"

محسن نے ابھی فرض نماز ہی پڑھی تھی کہ اچانک ایک دل دوز "چاں" کی آواز آئی۔ وہ ننگے پاؤں بھاگا۔ اس کا اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ خدا بخش حقہ پیتے ہوئے نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا کہ پپی گل جنگ کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک ہی پنجے میں اس کی انتڑیاں نکال باہر کیں۔ محسن نے سر پر بندھے رومال میں پپی کو لپیٹا اور ننگے پیر ویٹری ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچا تو ننھی سی جان میں کیا بچا تھا۔ اسے دفن کر کے صدمے سے نڈھال واپس آیا تو خدا بخش کو دیکھتے ہی اس پر غصے کا بھوت سوار ہو گیا۔ باورچی خانے سے بڑی سی چھری نکال لایا اور خدا بخش کی طرف بڑھا۔

نوکروں نے محسن شاہ کو پکڑا اور مہرالنساء نے خدا بخش کو کمرے میں بند کر دیا۔ مہرالنساء نے ہاتھ

جوڑے، ترلے کیے، غصے کو جانے دیں۔ اس نے کون سا جان بوجھ کر مارا ہے۔

''میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بھی اس کی انتڑیاں وہی کی طرح ہی نکالوں گا۔ میں نے اس کو تاکید کی تھی کہ اس کا دھیان رکھے۔ اس کی لاپرواہی سے اس کی جان گئی۔'' سارا دن گزر گیا نہ گھر میں کھانا پکا نہ کسی نے کھایا۔

مہرالنساء نے محسن کے قریبی دوستوں کو بلایا۔ بڑی مشکل سے اس بات پر رضامند ہوا کہ ''یہ مجھے اپنی شکل دکھائے بغیر یہاں سے چلا جائے۔'' خدا بخش کی روانگی کا منظر بڑا دل دوز تھا۔ مہرالنساء سمیت گھر کے سب ملازم اور خدا بخش سب ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ محسن کو اس کے دوست لے گئے تھے۔

خدا بخش کو گئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ پر گھر میں ابھی تک اُداسی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ سب کو چپ سی لگ گئی تھی۔

تعبیر پہلے تو کئی روز بالکل خاموش سی ہوگئی۔ پھر بے تحاشہ چڑچڑی ہوگئی۔ بات بات پر ضدیں کرتی اور بلاوجہ روتی رہتی۔

ایک روز سو کر اُٹھی تو مسلسل رو رہی تھی۔ رات بھی مہرالنساء کو اس کا جسم گرم سا لگا تھا۔ دن چڑھے تک اسے تیز بخار ہوگیا۔ بیس بائیس روز گزر گئے تھے۔ بخار تھا کہ ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دعائیں، دوائیں کچھ بھی کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی ڈاکٹر حکیم نہیں چھوڑا تھا۔ ہنستی کھلکھلاتی تعبیر توری کے پھول جیسی ہوگئی تھی۔ بالکل خاموش پڑی رہتی تھی۔ رونا بھی جیسے بھول گئی تھی۔ کھانا پینا بھی تقریباً چھوڑ چکی تھی۔ آواز پر آنکھیں کھولتی پھر جیسے بیزاری یا نقاہت سے بند کر لیتی۔ مہرالنساء کا رو رو کر برا حال تھا۔ محسن شاہ بھی بے حد پریشان تھا۔

ایک روز محسن اسے گود میں لیے بیٹھا تھا اور اسے بہلانے کو باتیں کیے جا رہا تھا۔

''میری گڑیا! میری جان! سرکس دیکھنے چلو گی؟'' تعبیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''قلاقند کھاؤ گی؟ پریوں جیسا فراک لو گی؟ بولنے والا طوطا لینا ہے؟'' سب کے جواب میں نفی میں سر ہل رہا تھا۔ محسن کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ''میری جان! اچھا تم خود بتاؤ تم نے کیا لینا ہے؟'' جواب میں آنکھوں میں ایک حسرت تھی۔

''جو تم کہو گی میں اپنی گڑیا کو لا کر دوں گا۔''

''تعبیر کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ وہ سسکی میں بولی ''پاء بسا لینا ہے۔''

محسن نے اسی وقت مہرالنساء کو تیاری کا حکم دیا۔

وہ حیران پریشان ''اسی وقت'' ''ہاں اسی وقت اور ابھی چلیں گے۔''

دن کے ڈھائی بجے وہ دھاریوال پہنچے۔ وہاں پہنچ کر خدا بخش قصائی کا پوچھا۔ بھرے بازار میں لوگوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ محسن شاہ، پاء بسا اور تعبیر تینوں ایک دوسرے سے لپٹے دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔

مہرالنساء کے آنسو بھی تواتر سے بہہ رہے تھے۔

''خدا بخش دیکھو! تمہاری جدائی میں تمہاری پاء ٹو کا کیا حال ہوگیا ہے۔ جب سے تم آئے ہو ایسا بخار چڑھا ہے کہ اُترنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔'' مہرالنساء روتے ہوئے بولی۔

پاء بسا کبھی تعبیر کے ہاتھ چوم رہا تھا، کبھی پاؤں، روتا جاتا تھا اور کہتا تھا۔

''میں اپنی پاء ٹو کو اب کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چاہے شاہ جی مجھے دھکے مار کر نکالیں۔''

ڈاکٹر شمیم آزر/امریکا

مانٹریال، ڈاؤن ٹاؤن کی ایک شام

شام جس وقت اندھیروں سے گلے ملتی ہے
ہاتھ میں ہاتھ دیے شانوں پہ سر رکھے ہوئے
یوں گزر جاتے ہیں کچھ سائے سے باہم اُلجھے
بھاگتے دوڑتے اس شہر کے ہنگاموں میں
وقت کچھ دیر کو رُکتا ہے پلٹ آتا ہے
گردِ امروز میں سوئے ہوئے کل کے منظر
ذہن کے شہرِ فراموش کی دیواروں پہ
اک تسلسل سے اُمڈتے ہیں بکھر جاتے ہیں
عہدِ گم گشتہ کی گلیوں میں کہیں گم لمحے
پھر تصور کے نہاں خانوں سے در آتے ہیں
جیسے اک عمر کے آوارہ و سرگرداں لوگ
ایک دن چپکے سے تھک ہار کے گھر آتے ہیں
اور پھر منتظر آنکھوں سے کوئی خواب سی رات
اشک بنتی ہے چھلکتی ہے بکھر جاتی ہے

غزل

زندگی دادِ وفا مانگتی ہے
اپنے لٹنے کا صلہ مانگتی ہے
یہ لرزتی ہوئی بنیادِ وطن
پھر سے خونِ شہدا مانگتی ہے
جبر تقدیر سے لڑتی ہوئی خلق
صرف امدادِ خدا مانگتی ہے
پھر فراعین ہوئے تخت نشیں
قوم موسیٰ کا عصا مانگتی ہے
تجھ سے بچھڑی ہوئی اُجڑی ہوئی زیست
دل میں اک شہر بسا مانگتی ہے
جس سے بچھڑے ہی نہیں ہیں آزر
اُس سے ملنے کی دُعا مانگتی ہے

گیٹ وَیل سون (Get well Soon)

رابنسن سیموئیل گل/راولپنڈی

معمول کے مطابق چڑیاں فیروزہ کے چھوٹے سے لان میں دانہ دنکا چگنے میں مصروف تھیں۔ فیروزہ اپنے کچن کی کھڑکی کے قریب آرام کرسی پر بیٹھی اُن چڑیوں کو دیکھ رہی تھی اور وقتاً فوقتاً ادھ کھلی کھڑکی سے ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے ڈال دیتی تھی۔ چڑیاں اُس سے خاصی مانوس تھیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ پرندوں کی نئی نسل بھی پرانی میں شامل ہو چکی تھی اور شاید کئی چڑیاں مر بھی چکی تھیں۔ فیروزہ نے انھیں اپنی تنہائی کا دوست بنایا ہوا تھا۔ چڑیوں کی چہکار اور دانے دنکے کے حصول کے لیے ان کا ایک دوسرے پر جھپٹنا ہی فیروزہ کے خاموش و ویران آنگن میں زندگی کا احساس پیدا کرتا تھا۔

آرام کرسی پر بیٹھی وہ روزانہ کی طرح اپنے ماضی کو یاد کر رہی تھی۔ ماضی کی یاد، پرندوں کی موجودگی کے علاوہ ایک اور ساتھ تھا، جس کے سہارے وہ اب تک زندہ تھی۔

لندن آئے ہوئے اُسے تقریباً چالیس برس ہو چکے تھے۔ کئی موسم آئے اور کئی گئے۔ وہ انگلستان کی کئی بہاریں اور کئی خزائیں دیکھ چکی تھی مگر اب تو شاید خزاں نے ہی ہر طرف گھر کر لیا تھا۔ اُس کے لیے بہار کے موسم میں بھی بہار کا کہیں نام ونشان نہ ہوتا۔ اُس کی زندگی ایسے درخت کی مانند تھی جو رفتہ رفتہ اپنی تمام تر شان وشوکت، اپنی خوبصورتی اور اپنا حُسن کھو رہا تھا۔ فیروزہ کی زندگی کا ہر لمحہ کسی ایسے ہی درخت کے سوکھے پتوں کی مانند لمحہ بہ لمحہ، دن بدن، اُس کے وجود سے جدا ہو رہا تھا۔ وقت کے پہیئے رفتہ رفتہ گردش تو کر رہے تھے مگر ان لمحوں کی گاڑی جس پر فیروزہ سوار تھی، اک عرصہ دراز سے رک چکی تھی۔ زندگی میں کوئی امید باقی نہ رہی تھی، اک تنہائی تھی جو 'چڑیوں' اور 'ماضی کی یاد' کے علاوہ ایک اور ساتھ تھا۔

جب زندگی میں کوئی ساتھ نہیں رہتا تو اکثر تنہائی ہمدرد بن کر آتی ہے اور ساتھ نبھانے کی کوشش کرتی ہے۔ تنہا انسان اُسے چاہے بھی تو دھتکار نہیں سکتا کیوں کہ وہ ایک بار پھر دروازے پر آ دھمکتی ہے اور انتہائی ثابت قدمی اور پراعتمادی سے پکار کے کہتی ہے:

''میرے سوا کوئی ساتھ نبھانے والا نہیں ملے گا، مجھے اپنا ساتھی بنالو!''

آخر بے چارہ انسان ہتھیار ڈال دیتا ہے، اُسے دروازہ کھول دینا پڑتا ہے۔ جب تنہائی ایک بار گھر کر لیتی ہے تو زہر تنہائی بن جاتی ہے۔ زندگی کا ہر موجودہ لمحہ بے جان ہو جاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی ساکت ہو جاتی ہے۔ یہ تنہائی انسان کی ہستی میں ایسا زہر گھولتی ہے کہ ہر لمحہ، سوکھے پتوں کی مانند، لاشعوری طور پر اُس سے جدا ہوتا جاتا ہے، اُس کا ساتھ چھوڑتا جاتا ہے اور آخر وہی انسان جو کسی ہرے بھرے درخت کی مانند ماضی میں بڑی شان وشوکت سے اپنے وجود کا سر تا پا اعلان کرتا ہے، ایک سوکھا، بے جان اور ٹنڈ منڈ درخت بن کر رہ جاتا ہے۔ سوکھے پتے اُسے اپنے تابناک ماضی کی یاد دلاتے اور ہر پل رلاتے رہتے ہیں۔ خزاں کا سوکھا درخت بہار کا بے صبری سے انتظار کرتا ہے، اک امید کے سہارے وہ ڈٹا رہتا ہے، خواہ کتنی بھی آندھیاں چلیں، تیز ہواؤں کے جھونکے اُس سے ٹکرائیں۔ وہ سوکھے پتوں پر تو سمجھوتہ کر لیتا ہے لیکن اپنی ہستی کا سودا نہیں کرتا کیوں کہ اُسے بہار کا انتظار ہوتا ہے، نئے پتوں کی امید ہوتی ہے۔

مگر فیروزہ کی زندگی میں تو کوئی امید باقی نہ تھی۔

اُسے وہ دن یاد آیا جب اُس کے شوہر نے اپنا ملک چھوڑ کر انگلینڈ آنے کا ارادہ کیا تھا۔ پاکستان میں انھیں کس شے کی کمی تھی۔ اُس کے شوہر کا اپنا کاروبار تھا، گھر بار تھا اور ماں باپ کی طرف سے وراثت میں ملی تھوڑی بہت زمین۔ سب سے بڑھ کر اپنوں کا پیار تھا، چاہت تھی، ساتھ تھا۔

فیروزہ کو شادی کے وہ ابتدائی سال یاد آ رہے تھے جو اُس نے اپنے جیون ساتھی کے بنا گزارے۔ اُس وقت بھی تنہائی ہی ساتھ دیتی تھی۔ اُن کا پہلا بچہ جس کا نام شکیل رکھا گیا، پیدا ہوا تو وسیم لندن آ چکا تھا لہٰذا وہ اُسے نہ دیکھ سکا۔ افسوس کہ وسیم جب اپنے ہی خون کو تین سال کے بعد ملا تو وہ اپنے باپ کو کوئی غیر شخص سمجھ کر اُس کی گود میں آنے سے ڈرتا تھا۔ پاکستان کے مختصر دورے کے بعد وسیم واپس انگلینڈ آ گیا۔ شکیل کے بعد اُن کے گھر میں اک چاندی بیٹی نے جنم لیا۔ ماہ نُور کی پیدائش پر بھی وسیم لندن میں ہی تھا۔

فیروزہ آرام کرسی کو معمول کے مطابق آہستہ آہستہ جھلاتے ہوئے، پرنم آنکھوں سے اُن تمام یادوں میں کھوئی ہوئی تھی جو اُس کے لیے جینے کا سہارا تھیں۔ اُسے اپنے بچے یاد آئے جن کا بچپن باپ کے سائے کے بغیر گزرا۔ بچے باپ کے صحیح معنوں اور اُس کی شفقت سے بالکل ناواقف تھے۔

شادی کے پہلے پندرہ برس فیروزہ نے پاکستان میں اور وسیم نے پردیس میں گزارے۔ آخر وہ دن

آ گیا جب پورا خاندان لندن میں تھا۔ وہ مقصد جس کے حصول کے لیے دونوں میاں بیوی نے اب تک قربانی دی تھی اور اپنی ازدواجی زندگی کے قیمتی ابتدائی سال ایک دوسرے کی جدائی میں بتائے تھے، آج حاصل ہو چکا تھا۔ اُس دن کی تصویر کسی فلم کی طرح فیروزہ کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ وہ ہیتھرو ائیر پورٹ (Heathrow Airport) پر اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ پہنچی۔ شکیل چودہ برس کا اور ماہ نُور گیارہ برس کی ہو چکی تھی۔ وہ تمام منظر فیروزہ واضح طور پر تصور کر سکتی تھی۔ کیسا خوبصورت دن تھا؟ کتنا حسین سماں تھا جب پورا خاندان حقیقی معنوں میں اکٹھا تھا۔ دونوں میاں بیوی کی آنکھوں میں اُس وقت بھی آنسو تھے، خوشی اور غمی کے آنسو۔ خوشی اِس بات کی کہ جدائی ختم ہوئی، تنہائی دُور ہوئی اور غم اِس بات کا کہ جدائی اور تنہائی اپنے ساتھ جوانی بھی لے گئی، جذبات کی وہ گرمی جو جدائی کے اُس طویل عرصے کو عذاب بنا ڈالتی تھی رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ فیروزہ کے بالوں میں چاندی آ چکی تھی۔ خوشحالی اور عیش و عشرت کی اِس سرزمین پر قدم رکھتے ہی، فیروزہ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہم نے کیا پایا؟

اِنسان کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ کسی شے کے پیچھے طویل عرصے تک بھاگتا رہتا ہے تو اُس کی خواہش اُس شے کے حصول کے لیے بڑھتی جاتی ہے لیکن آخر جب وہ اُسے پالیتا ہے تو اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عام سی شے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا اور اکثر اُس شے کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ کیا انگلینڈ زیادہ اہم تھا یا میاں بیوی کا شادی کے ابتدائی سالوں میں ایک دوسرے کی قربت میں رہنا؟ کیا بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے دولت کی فراوانی زیادہ اہم تھی یا بچوں کے سر پر اُن کے باپ کا سایہ اور اُس کی شفقت؟

فیروزہ اب تک اُسی انداز میں آرام کرسی پر اپنا سر پشت پر دائیں جانب جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کا دایاں کندھا بھیگا ہوا تھا۔ آنسو بھی سوکھے پتوں اور بے جان لمحوں کی مانند گرتے اور اُس کے کپڑوں میں جذب ہو جاتے تھے۔ چڑیوں کی چہکار اب تیز ہو رہی تھی کیوں کہ فیروزہ اپنے خیالوں میں گم انھیں خوراک ڈالنا بھول گئی تھی۔ اچانک دروازے پر شور ہوا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ ڈاکیا کچھ خطوط دروازے کے لیٹر بکس میں ڈال گیا تھا۔ اِک ہلکی سی امید کی کرن پیدا ہوئی، 'ہوسکتا ہے بچوں میں سے کسی کا خط آیا ہو'۔ اُس نے دل میں سوچا۔ خط لے کر واپس باورچی خانے میں آئی مگر سوائے سرکاری خطوط اور چند کمپنیوں کی جانب سے اُن کی اشیاء کی اشتہار بازی کے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ بڑے بجھے دل کے ساتھ کافی کا کپ بنانے کے بعد پھر اُسی کرسی پر بیٹھ گئی اور دوبارہ سے یادوں کا سلسلہ اُسی جگہ سے جوڑنے لگی جہاں سے منقطع ہوا تھا مگر اب اُس گہرائی تک نہ پہنچ سکی۔

دن راتوں میں اور راتیں دنوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ خزاں اپنے پیچھے ویرانی و بے رونقی کے علاوہ سرد موسم بھی چھوڑ گیا تھا۔ بارشوں کا سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا جس کے باعث چڑیاں بھی کم ہی نظر آتی تھیں۔ موسم میں تبدیلی فیروزہ کی صحت میں بھی تبدیلی لا رہی تھی۔ عمر کا تقاضا تھا کہ بدن میں قوتِ مدافعت کم ہو چکی تھی۔ گزشتہ رات کافی دنوں کے بعد فیروزہ نے فون پر اپنے بیٹے شکیل سے بات کی۔

''ممی، آپ کی آواز سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ پلیز ڈاکٹر کو ضرور دکھائیں، اور ہاں اپنے آپ کو گرم رکھا کریں آج کل ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ بالکل بھی فکر مند نہ ہوں میں اِسی ہفتے آپ کو ملنے آؤں گا، بس کام بہت زیادہ ہوتا ہے سمجھ نہیں آتی کہ دن کیسے گزر جاتا ہے۔ میں ضرور آنے کی کوشش کروں گا۔''

فیروزہ کے لیے اپنے بیٹے کے یہ فقرے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ خواہ وہ مصروف ہو یا فارغ، ماں کا پتا کرنے کے لیے آنا اُس کے لیے اکثر ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ فیروزہ اپنے بچوں کو کم ہی فون کرتی تھی کیوں کہ وہ اُن کے خاندانی معاملات یا روز مرہ زندگی میں دخل اندازی پسند نہیں کرتی تھی۔ آخر وہ ہفتہ بھی اپنے اختتام کو پہنچا مگر شکیل یا ماہ نُور نے دوبارہ فون کرنے کے علاوہ خود آنے کی زحمت نہ کی۔

سردی واقعی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ آج موسم میں خنکی تھی۔ فیروزہ گزشتہ روز سے زیادہ ٹھنڈ محسوس کر رہی تھی۔ نزلہ وزکام کی وجہ سے طبیعت میں بوجھل پن محسوس ہوتا تھا۔ جب کھانستی تو چھاتی میں درد اٹھتا۔ روزانہ ڈاکٹر کے پاس جانے کا سوچتی لیکن کبھی طبیعت نہیں مانتی تھی تو کبھی بارش روک لیتی تھی۔ اپنے بچوں سے بھی مطالبہ نہ کرتی تھی کہ خواہ مخواہ اُن کی روٹین خراب ہوگی۔ اگرچہ وہ ایمبولینس کو بھی فون کر کے بلا سکتی تھی مگر اب شاید اُس کے دل میں کوئی امنگ باقی نہ تھی، جینے کی کوئی تمنا نہ تھی۔ آخر جیئے تو کس کے لیے؟ ایک ایسا درخت جو پتے بھی کھو دے اور جڑوں سے بھی کھوکھلا ہو جائے، بہار کی امید رکھے بغیر اکثر آندھی کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ فیروزہ بھی شاید کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔

بارش ہوتی تو چڑیوں کا ساتھ بھی چھوٹ جاتا، صرف تنہائی باقی رہ جاتی۔ گھنے سیاہ بادل موسم کو اور زیادہ غمگین بنائے رکھتے۔ ہر طرف اِک اُداسی کی سی کیفیت چھائی رہتی۔ فیروزہ اپنی آرام کرسی پر آہستہ

آہستہ جھولتی، لان میں اُس مقام کو دیکھ رہی تھی جہاں چڑیاں اکثر دانہ چگنے آتی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بادل برسنے والے ہیں۔ کالی گھٹائیں اور تیز ہوا کے جھونکے طوفان کی پیش گوئی کر رہے تھے۔

فیروزہ اپنے خاوند کے آخری ایام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وسیم کی خواہش تھی کہ اپنے بچوں کو آخری بار دیکھ لے، اُن سے دو گھڑی بات کر لے مگر اُس کی تمنا پوری نہ ہو سکی۔ بچے باپ کے جیتے جی آ تو گئے مگر اُس وقت باپ کو ہوش نہ رہا تھا۔ مغرب اُن سے اُن کے بچے چھین چکا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد بچے کچھ دن آ کر ٹھہرے۔ شکیل ماں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا مگر ولائتی بہو کے باعث جلد ہی اُسے ماں کو واپس چھوڑنا پڑا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی ماں کو اولڈ ہوم (Old Home) میں رکھے جہاں اُس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔ مگر فیروزہ نے ہی یہ سوچتے ہوئے انکار کر دیا کہ جب میرے اپنے بچے میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تو غیروں پر کیوں بوجھ بنوں اور کہیں اور کیوں رہوں؟ لہٰذا اُس نے اپنے خاوند کے گھر میں ہی رہنا پسند کیا۔ خوش قسمتی سے یہ پراپرٹی اُسی کے نام تھی۔ فیروزہ کے خاوند کو فوت ہوئے چار برس بیت چکے تھے۔ اِس دوران وہ گورنمنٹ کی جانب سے ملنے والی پینشن (Pension) کے سہارے ہی جی رہی تھی۔

موسم ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ مطلع صاف ہونا شروع ہو گیا تھا مگر ہلکی ہلکی ہوا اب بھی چل رہی تھی۔ پرندے اپنے ٹھکانوں سے نکل آئے تھے۔ غالباً بارش نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ چڑیوں کی چہکار سن کر فیروزہ کے دل میں ہلکی سی خوشی کی لہر اٹھی۔ اُس نے جلدی سے چاولوں کے کچھ دانے کھڑکی کھول کر باہر پھینکے۔ سرد ہوا کا ہلکا سا جھونکا اُس کے گرم بدن سے ٹکرایا۔ اُس کے سینے میں ہلکی سی ٹیس اٹھی۔ کھڑکی فوراً بند کرنے کے بعد وہ دوبارہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ چڑیوں کا مشاہدہ کرتی رہی اور ہمیشہ کی طرح سوچوں میں ڈوبی رہی۔

دروازے پر ہلکا سا شور ہوا اِس بار اخبار والا تھا مگر فیروزہ نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اُس کے سینے کا درد بڑھ رہا تھا۔ وہ کرسی کو اب بھی جھلائے جا رہی تھی۔ اپنی اُداسی، بے بسی، بچوں سے ملنے کی خواہش اور سینے میں شدید درد کا اظہار وہ اپنے آنسوؤں سے کر رہی تھی۔ اُس نے سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ چڑیاں دانہ ختم کر چکی تھیں اور اب مزید کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ اُن کی چہکار بلند سے بلند تر ہو رہی تھی۔ دروازے پر ایک بار پھر کوئی آیا۔ اِس بار ڈاکیا چند خطوط لایا تھا۔ لندن کے بے اعتبار موسم نے ایک بار پھر اپنا رنگ دکھایا۔ اچانک بادل گرجے اور نہ جانے کہاں سے ایک کالی گھٹا اپنے ساتھ بارش کے قطرے لے آئی۔ چڑیاں فوراً اپنی پناہ گاہوں کو لوٹ گئیں۔

فیروزہ اب تک کرسی پر اُسی طرح آنکھیں موندھے بیٹھی تھی مگر اب کرسی بالکل ساکت ہو چکی تھی۔ بارش طوفان کا روپ دھار چکی تھی۔ پرندے اپنے ٹھکانوں میں سہمے بیٹھے تھے۔ طوفان آتے ہی وہ فیروزہ کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ ہاں البتہ تنہائی وہیں موجود تھی مگر اب تنہائی... تنہا رہ گئی تھی۔ اِس بار فیروزہ اُس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

تازہ ڈاک میں آنے والے خطوط میں سب سے اوپر والا لفافہ فیروزہ کے بیٹے شکیل کی جانب سے تھا جس میں اُس نے اِس ہفتے بھی نہ آ سکنے کی معذرت چاہی تھی اور ماں سے اپنی محبت کا اِظہار کرتے ہوئے ایک عدد گیٹ ویل سُون (Get Well Soon) کا کارڈ ارسال کیا تھا۔

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

محبت کے بہانے سے بلا کا وار کرتا ہے
مفاد اپنے کی خاطر پھر وہ سب کو پار کرتا ہے
کبھی انکار کرتا ہے، کبھی اقرار کرتا ہے
جو سچ پوچھو تو چاہت سے ہی دل بیزار کرتا ہے
دکھاتا ہے چمک ایسی کہ آنکھیں موند لیں سارے
اسی تاریک منظر میں وہ دامن تار کرتا ہے
حقیقت سے کبھی پردہ اٹھانے کی کریں کوشش
نظر آتا ہے منظر میں نہ آنکھیں چار کرتا ہے
محبت کے اصولوں میں اصولِ نو کا موجد ہے
زیادہ قرب والوں کو وہ زہب دار کرتا ہے
مکارانہ رویوں سے وقار اپنا بچانے کو
وہ بسمل ساتھ چلتوں کو بھی زیرِ بار کرتا ہے

راؤ وحید اسد/ملتان

تجھ پہ ایمان محبت کے لیے کافی ہے
تو مری جان محبت کے لیے کافی ہے
ویسے لاہور، کراچی بھی ہیں اچھے لیکن
تیرا ملتان محبت کے لیے کافی ہے
یار آ جاتے ہیں بھر جاتی ہے دل کی بیٹھک
مان سمان محبت کے لیے کافی ہے
یوں تو پرنور سے چہرے بھی بہت ہیں لیکن
ایک قرآن محبت کے لیے کافی ہے
تو بچھڑ کر جو گیا ہے تو یہ معلوم ہوا
تیرا نقصان محبت کے لیے کافی ہے
بات اتنی سی ہے مخلص نہیں ہوتا ورنہ
ایک انسان محبت کے لیے کافی ہے
جسم کے اور تقاضے ہیں وگرنہ مرے دوست
تیرا اعلان محبت کے لیے کافی ہے

جیت

عالیہ ذوالقرنین

رات کے ملگجے اندھیرے میں سنٹرل جیل کی کوٹھری نمبر 27 میں جھولتے زرد بلب کی روشنی عجیب پُراسراریت پیدا کر رہی تھی جیسے کوئی نیم جلتا چراغ جو بجھنے سے پہلے اپنا تمام تر دکھ فضا میں بکھیر دینا چاہتا ہو۔ تاریکی میں بدقت تمام چلتے پنکھے کی آواز جہاں ماحول کو ٹھنڈا کرنے سے قاصر تھی وہیں مچھروں کو بھگانے پر بھی قادر نہ تھی۔ دیوار پر لٹکی گھڑی میں بظاہر وقت چل تھا مگر یہاں کے مکینوں کے لیے گویا رک سا گیا تھا ۔کمرے کے ایک کونے میں کھچڑی بالوں والا شخص کوٹھری کی فرش پر چادر میں لپٹا بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی الجھی ہوئی تھی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ...... جیسے دنیا سے کوئی راز چرا کر اپنے سینے میں دفن کر لیا ہو۔ یہ حاشر قمر تھا۔

جیل کی فائلوں میں وہ ایک قیدی تھا جس نے آٹھ برس قبل ایک سنگین قتل کا اعتراف کیا تھا۔ عدالت نے اسے سزائے موت سنائی لیکن نفسیاتی معائنے کے بعد اسے کاپرولالیا کا مریض قرار دے کر جیل کے مخصوص وارڈ میں رکھا گیا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ بار بار فحش زبان استعمال کرتا تھا بے محابا، بغیر کسی تناظر کے مگر...... اس کے جملوں میں محض گالیاں نہ ہوتیں، کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے وہ کسی پوشیدہ راز کو عیاں کر رہا ہو۔

''لعنت ہے تم پر، تم نے اپنی ماں کا دودھ بیچ دیا ہاں، تُو ہی تھا نا...... وہی جو رات کی تاریکی میں وہ سب کرتا تھا، میں نے دیکھا تھا تجھے، ہاں میں نے!''

سپاہی اکثر اس کی چیخیں اور گالیاں سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔ کچھ اسے پاگل سمجھ کر ہنستے، کچھ ڈرتے مگر ڈاکٹر عبیہہ، جو ہر ہفتے مریضوں کی کونسلنگ کے لیے آتیں، اس کی زبان سے پھسلتے الفاظ میں کچھ اور تلاش کرتی تھیں۔

ڈاکٹر عبیہہ خود بھی خاموشی سے بہت سی کہانیاں اپنے اندر دفن کیے ہوئے تھیں۔ ایک بار پڑھائی کے دوران ان کے پروفیسر نے ان کے ساتھ کچھ غلط کرنا چاہا تو وہ پروفیسر کا پول کھولنے کے لیے زبان کھول بیٹھی اور پورے ڈیپارٹمنٹ نے لعن طعن کے بعد انہیں پروفیسر کی ساکھ کو جھوٹ بول کر خراب کرنے والا سمجھ لیا۔ تب سے وہ خاموش نہیں رہتی تھیں مگر ان کی زبان میں شائستگی کا خنجر چھپا ہوتا۔ شاید اسی لیے وہ حاشر کی چیخوں میں چھپے استعاروں کی تہہ تک جانے کی کوشش میں تھیں۔

''حاشر، یہ بتائیں...... آپ نے زاہد کو قتل کیوں کیا؟'' وہ خاموش رہا، نظریں دیوار پر جمی رہیں۔ پھر اچانک مسکرایا: ''زاہد......؟ اوہ وہ کمینہ؟ اُس نے اپنی بہن کو بیچا تھا...... مگر سب نے کہا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تو پھر میں نے سچ کو خون سے لکھا اسی کے خون سے.. کیا برا کیا؟ ہاں؟ بولو ناں، تم ڈاکٹر ہو، انصاف کا پرچار بھی کرتی پھرتی ہوگی ناں؟ بولو...... تم بتاؤ!''

عبیہہ نے گہرا سانس لیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ سچ، گالیوں اور یادداشت کے اتار چڑھاؤ میں الجھا ہوا اعتراف۔

ایک دن عبیہہ نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لے کر حاشر کی پرانی فائلیں منگوائیں۔ جوں جوں وہ صفحات کھلتے گئے، ماضی کی تاریک تہیں بھی روشن ہوتی چلی گئیں۔

حاشر قمر، ایک اسکول ٹیچر، ایک عالم کا بیٹا، جس نے بچوں کو ادب اور اخلاق سکھاتے سکھاتے خود فحش زبان سیکھ لی۔ یہ جملہ ہر رپورٹ میں تھا، لیکن عبیہہ کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ وہ شخص جو الفاظ کا معمار تھا کیسے الفاظ کا مجرم بن گیا؟ زاہد کی پرانی شاگردہ، نیلم، ایک خاموش سی لڑکی، جس کے چہرے پر اکثر نیل ہوتے، آنکھوں میں خوف۔ حاشر نے جب پہلی بار اسے سوال کے جواب میں کچھ بڑبڑاتے دیکھا، تو وہ رک گیا۔ ''سر، میرا بھائی مجھے...... مجھے رات کو...... وہ دروازہ بند کر دیتا ہے......'' اس کے بعد وہ چپ ہوگئی۔

ایک پرانی فائل میں، زاہد نامی شخص کی بہن کا بیان درج تھا:

''میرے بھائی نے مجھے کئی بار بیچا مگر جب میں نے زبان کھولی تو سب نے کہا میں پاگل ہوں۔ صرف حاشر سر نے میرا یقین کیا۔ میں نے اُن سے کہا بس آپ میرے بھائی کو روک لیں۔ پھر...... پھر وہ مر گیا۔''

بیان پر کسی نے یقین نہ کیا۔ لڑکی بعد میں کسی پاگل خانے میں لے جائی گئی۔ حاشر نے سکول میں بات اٹھائی مگر پرنسپل نے اسے خاموش کر دیا۔

''تم استاد ہو، عدالت نہیں۔ اخلاق سکھاؤ، فیصلہ مت کرو۔'' وہ خاموش نہ رہ سکا۔ اسکول سے نکالا گیا۔ اس نے اخبار میں لکھا، مگر ادارے نے معذرت کر لی۔ پولیس میں شکایت کی، تو زاہد نے اُسے فحش زبان استعمال کرنے کے جھوٹے الزام میں دھروا دیا اور دوستوں نے بہت مشکل سے ضمانت پر بری کروایا

اس دن سے وہ چیخنے لگا۔ ہذیان اور گالیاں...... ایسی جو ہر سننے والے کو لگیں کہ یہ آدمی پاگل ہے۔ لیکن سچ ان گالیوں میں ہی لپٹا ہوا تھا۔

اگلے دن وہ دوبارہ کوٹھری میں گئی۔ حاشر چپ تھا۔ عبیہہ نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا:

"تم نے جو کچھ کیا، وہ جرم تھا یا سزا؟" وہ چونکا، پھر آہستہ سے بولا: "میں خاموش رہتا تو وہ لڑکی پاگل کہلاتی رہتی۔ میں چیخا، تو پاگل میں بن گیا۔ میری زبان میرے جسم کا بوجھ نہیں رہی، وہ سچ کی صلیب بن گئی۔ مجھے سچ بولنے کی سزا ملی ہے۔ سچ...... جو تہذیب کے ملبے سے نکل کر گالی بن گیا۔"

وہ کچھ لمحے رکا، پھر کہا:

"میری ماں نے مجھے سکھایا تھا، حاشر! تم جیسے لوگ خاموش رہیں تو سچ مر جاتا ہے اور میں خاموش نہ رہ سکا۔"

کوٹھری میں خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک مانوس گالی کی گونج ہوئی، لیکن اب عبیہہ کے لیے وہ گالی نہیں تھی، وہ ایک کچھ احتجاج تھی۔

چند ہفتے بعد، حاشر نے سزائے موت سے پہلے ایک آخری خواہش کی "میری قبر کے کتبے پر لکھوا دینا: 'یہ وہ تھا جس نے گالیاں دے کر سچ بولا'۔

اور جب وہ صبح آئی جس میں پھانسی کا پھندہ تیار کیا گیا تو کوٹھری نمبر ستائیس سے آخری آواز سنائی دی:

"تم سب کے چہروں پر سچ لکھا ہے...... اور زبانوں پر جھوٹ لرز رہا ہے۔ لعنت ہے......لعنت ہے تم سب پر!"

پھندہ جھولا اور جیل کی زرد روشنی بجھ گئی۔

ڈاکٹر عبیہہ نے اس کی قبر پر پھول رکھتے ہوئے کہا:

"تمہاری زبان گندی نہ تھی، زمانہ بہرا تھا۔" اس نے قبر کی مٹی پر ہاتھ پھیرا اور نجانے کیوں، اپنے آنسو چھپا لیے ڈاکٹر عبیہہ ہار گئی تھیں مگر حاشر قمر نے اپنی زندگی کا خراج دے کر سچ زندہ رکھا تھا۔

عاصم اعجاز/لاہور

چاند آنگن میں جب اترتا ہے
زرد پتوں میں رنگ بھرتا ہے
کون رکتا ہے عمر بھر کے لیے
عکس پانی میں کب ٹھہرتا ہے
کوئی کیسے کہیں پہ رک جائے
وقت ہر حال میں گذرتا ہے
حسنِ بےخود کو دیکھنے کے لیے
آئینہ دیر تک سنورتا ہے
اپنے جیسوں میں معتبر ہو کر
آدمی آدمی سے ڈرتا ہے
سارے موسم اداس رہتے ہیں
سانحہ جب کوئی گزرتا ہے
کیا تسلسل ہے بے نیازی کا
پھول خوشبو سے مانگ بھرتا ہے

عابد حسین عابد/خیبر پختونخوا

ہجر جب دل کا عارضہ ٹھہرا
صبر پھر ایک معجزہ ٹھہرا
ہارے لوگوں سے جیتنا تیرا
اک پسندیدہ مشغلہ ٹھہرا
چلتے چلتے زمانے بیت گئے
میں جہاں تھا اسی جگہ ٹھہرا
رمزِ ہستی کا در کھلا مجھ پر
میرا جب تجھ سے واسطہ ٹھہرا
تمہارے نام کا وہ آخری حرف
میری غزلوں کا قافیہ ٹھہرا
کوچ کرنے میں کیسے ہتھکنڈے؟
بارشوں کا تو سلسلہ ٹھہرا
ہر خطا کا وزن اٹھا لینا
سب سے سنگین مرحلہ ٹھہرا
زندگی کی سڑک پہ ٹکرانا
اک المناک حادثہ ٹھہرا
تم گگن میں زمیں کا باسی ہوں
نام کا ہی تو فاصلہ ٹھہرا
چاندنی زرد ہوگئی عابد
شہر میں دکھ کا قافلہ ٹھہرا

ماہنامہ الحمرا لاہور

ادب کا چراغ، روایت کا امین یہ رسالہ حضرت مولانا حامد علی خاں رحمہ اللہ کی یادگار کے طور پر شائع کیا جاتا ہے

لاہور کا معروف ادبی رسالہ جو برسوں سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے

ادب نواز شخصیت شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت

شاعری، افسانہ، تنقید، تحقیق، تراجم محفلِ احباب خصوصی گوشے۔ ہر شمارہ ایک نیا زاویہ، ایک نئی خوشبو

اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں یا خود کو قلم سے جوڑنا چاہتے ہیں

تو ماہنامہ "الحمرا" میں آپ کا پرخلوص خیر مقدم ہے!

اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اردو ادب کے اس قافلے کا حصہ بنیں

J-24 ماڈل ٹاؤن لاہور۔ 0333-4001844

اس بلا سے نجات ممکن ہے

عامر بن علی/ جاپان

چند دن پہلے فلپائن کے ساحل پر ایک وہیل مچھلی مردہ حالت میں پہنچی۔ ملحقہ شہر میں قائم مقامی میوزیم کے اہلکاروں نے سب سے پہلے اس واقعے کی اطلاع ذرائع ابلاغ کو پہنچائی، اور وہیل مچھلی کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ عجائب گھر کی انتظامیہ نے متعلقہ شعبے کے کو بھی ریسرچ کے لئے فوری طور پر مدعو کیا۔ محققین نے اس مچھلی کے پوسٹ مارٹم کے بعد جو اس کی موت کی وجہ بیان کی وہ کافی پریشان کن ہے۔ مردہ وہیل کے جسم کے اندر سے چالیس کلوگرام پلاسٹک شاپنگ بیگ ملے ہیں جنہیں عرف عام میں شاپر کہا جاتا ہے، یہی شاپر ممکنہ طور پر اس مچھلی کی موت کا سبب بیان کیئے گئے ہیں۔ گرچہ بلحاظ حجم وہیل مچھلی اس کرہ ارض میں پائی جانے والی مخلوقات میں سب سے بڑی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ایک من پلاسٹک بیگ کی اس کے معدے میں موجودگی بہت سارے سنجیدہ سوالات کو جنم دیتی ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ پلاسٹک شاپنگ بیگ کسی وہیل مچھلی کی موت کا سبب بنے ہوں۔ ماہرین کے مطابق گزشتہ برس بھی ایک وہیل مچھلی اسی وجہ سے ہلاک ہوگئی تھی کہ اس کے جسم کے اندر 80 شاپر چلے گئے تھے۔

سمندر میں بڑھتی ہوئی پلاسٹک کی مقدار بے حد سنجیدہ مسئلہ بن چکی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی زمین پر آباد تمام جانداروں کے لئے جان لیوا معاملہ بنتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں پلاسٹک بیگ یوں دردسر بن رہے ہیں کہ یہ صدیوں تک یوں کے توں دھرتی ساگر میں موجود رہتے ہیں، گلنے سڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ نہ ہی مٹی میں ملتے ہیں اور نہ ہی پانی میں حل ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے کوڑے دان جائزہ لیں تو اس میں موجود اشیاء کی واضح اکثریت چند سالوں میں مٹی یا پانی میں حل ہو جاتی ہے۔ بہت سارا کوڑا کرکٹ تو زمین کی زرخیزی کا سبب بھی بنتا ہے۔ فضلہ وغیرہ کھاد کا کام کرتا ہے۔ آپ یہ جان کر شاید حیران ہوں گے اور ممکن ہے کہ پریشان بھی ہو جائیں، کہ پلاسٹک بیگ کو گلنے سڑنے اور حل ہونے میں ایک ہزار سال تک کا عرصہ لگ سکتا ہے۔

جی ہاں! پلاسٹک بوتل یا شاپر ممکنہ طور پر ایک ہزار سال کے طویل عرصہ تک زمین پر آلودگی کا سبب بن سکتے ہیں۔ پلاسٹک بوتل یا دیگر اشیاء کو گلنے سڑنے لے لئے یوں تو پلاسٹک شاپنگ بیگ سے بھی زیادہ وقت درکار ہے، مگر یہ چھوٹا مسئلہ اس لئے ہے کہ عمومی طور پر پلاسٹک کی دیگر اشیاء بار بار استعمال ہوتی ہیں، بوتلیں ری سائیکل کر لی جاتی ہیں، جبکہ شاپر صرف ایک مرتبہ استعمال ہو کر ہماری زمین میں آلودگی کا حصہ بن جاتے ہیں، وہ بھی ایک انتہائی طویل مدت کے لئے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پلاسٹک بیگ سے عملی طور پر نجات ممکن ہے؟ جی ہاں! بالکل ممکن ہے۔ اس بارے میں آپ کو ایک تازہ مثال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میرا برسوں سے لاطینی امریکہ میں بالعموم اور چلی میں بالخصوص آنا جانا رہتا ہے۔ کئی سال تک وہاں قیام پذیر بھی رہا۔ اس نئے سال کی ابتدا کے ساتھ ہی چلی کی حکومت نے پلاسٹک شاپنگ بیگ پر پابندی عائد کردی۔ اس بیان کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہم عملی طور پر ان مسائل سے کیسے نمٹیں گے جو شاپر پر پابندی کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کے بہت عادی ہو گئے ہیں۔ نیز یہ سوال بھی اہم ہے کہ اس پابندی پر عمل درآمد یقینی کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ اس بابت چلی کی حکومت نے پہلا قدم تو یہ اٹھایا کہ تمام بڑے شاپنگ سینٹرز اور سپر سٹورز کو پابند کردیا کہ وہ پلاسٹک بیگ استعمال نہیں کریں گے، شاپر میں سودا بیچنا ممنوع قرار دے دیا گیا، متبادل کے طور پر کپڑے اور پولیسٹر کے تھیلے قیمتاً فروخت ہونے لگے ہیں۔ گھر کا سودا سلف لانے کے لئے ایک بار خریدا ہوا کپڑے کا تھیلا بار بار استعمال ہوتا رہتا ہے، ظاہر ہے ہر بار خریداری کرتے وقت آپ نیا تھیلا نہیں خریدیں گے، چونکہ بہر حال پیسے ضائع ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے شاپنگ پر نکلتے وقت چلی میں اب لوگ تھیلا ساتھ لے جانے لگے ہیں۔ جیسا کہ شاپر کی منحوس ایجاد سے پہلے ہمیشہ ہوتا تھا۔ میرے خیال میں ماحول کے تحفظ کی یہ بہت ہی تھوڑی قیمت ہے جو ہمیں بخوشی ادا کرنی چاہیئے۔

آپ اندازہ لگائیں کہ ہمارے پورے ملک میں ایک دن میں کتنے پلاسٹک بیگ استعمال ہوتے ہیں، اور پھر ہر روز یہ کیسے آلودگی میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمیں پلاسٹک شاپنگ بیگ کی عادت اپنائے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ میری مرحومہ پھوپھی یہ شکوہ کیا کرتی تھیں کہ جب سے یہ نانہجار شاپر آئے ہیں چیزوں سے برکت ہی اٹھ گئی ہے۔ جیسے شاپر تیز ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں، ویسے ہی ان میں لایا گیا سودا سلف بھی غتربود ہو جاتا ہے، فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے، ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ دارالحکومت سنتیاگو میں شاپنگ مال سے ایک جیکٹ خریدی تو کیشئر نے مجھ سے سوال پوچھا کہ کیا آپ کپڑے کا تھیلا خریدنا پسند کریں گے؟ میں نے سوچا صرف جیکٹ ہی تو ہے ہاتھ میں پکڑ کر پیدل نکلا تو محسوس کیا کہ اکثر لوگ سودا سلف ہاتھ میں پکڑے ہی لے جارہے تھے، اور وہ سب کچھ پہلے سے ہی پیک شدہ ہوتا ہے۔

جاپان میں شاپر کے استعمال میں کمی کے لئے شاپنگ سنٹرز شاپر کی قیمت الگ سے وصول کرنے لگے ہیں تا کہ لوگ کم سے کم پلاسٹک بیگ میں اپنا سامان لے جانے کی کوشش کریں۔ عہد ساز صحافی منو بھائی اکثر ایک افریقی ضرب المثل دہرایا کرتے تھے، کہ یہ زمین ہم نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں نہیں پائی بلکہ یہ دھرتی آنے والی نسلوں کی ہمارے پاس امانت ہے۔ گزشتہ برس برطانوی حکومت یہ چشم کشا رپورٹ شائع کی ہے کہ آنے والے دس برسوں میں سمندر میں پلاسٹک کی مقدار آج کے مقابلے میں تین گنا مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے، اگر اس بارے میں کوئی فوری اور سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا گیا۔

CS CamScanner

شاعری

کیا مقدر میں بھی لکھا ہوا ہے
جو مری زندگی بنا ہوا ہے
میں کسی لمحے میں پڑی ہوئی ہوں
وہ کسی عہد میں رُکا ہوا ہے
پاؤں باہر دھرا تو کیا ہوگا
خواب دہلیز پر رکھا ہوا ہے
اک اکیلا جو ساتھ ہے میرے
اب وہی دوسرا بنا ہوا ہے
باغ سے یہ ہوا تو لائی نہیں
پھول کھڑکی میں جو رکھا ہوا ہے
جسم آدھا ہے میرا دنیا میں
آدھا دیوار میں چُنا ہوا ہے

لبنیٰ صفدر / لاہور

''مگر ہم دیر سے آئے''

درختوں سے بھرا رستہ
تمہارے ہاتھ ہاتھوں میں
سُنو جاناں!
جہاں جنگل ہے گہرا سا
جہاں جنگل میں ہم تم ہیں
وہاں ہم دیر سے آئے۔۔۔۔۔۔
سنو ہم دیر سے آئے
ندی نیلی ہو جتنی بھی
فلک جُھک جائے جتنا بھی
تمہاری مدھ بھری آنکھیں
مجھے بہکائیں جتنا بھی
محبت سے بھرے ارماں
ہمیں سلگائیں جتنا بھی
سُنو!
ہم دیر سے آئے۔۔۔
مگر وہ دیر کتنی ہے!
کہ صدیاں بیت بیٹھی ہیں؟
مگر سائے ہیں جنگل میں
جو کہتے کہ مر جاؤ
نہیں مرتے تو یوں سُلگو
کہ جل جاؤ۔۔۔۔
سُنو سائے تو سائے ہیں
اُنہیں معلوم بھی کیا ہے
کہ دل میں ایک چاہت ہے
مسلسل گُدگداہٹ ہے
سراسر سرسراہٹ ہے
بہت سی آہٹیں ہیں جو
بلاتی ہیں ستاتی ہیں
جگاتی ہیں سُلاتی ہیں
مُسلسل مُسکراتی ہیں
تمہاری مدھ بھری آنکھیں
مُسلسل بولے جاتی ہیں
میری سہمی ہوئی آنکھیں
زمیں کو دیکھے جاتی ہیں
بہت مضبوط بانہوں میں
محبت کسمساتی ہے
مگر جنگل میں بارش ہے
تمہاری آنکھیں کہتی ہیں
چلیں ہم بھیگیں بارش میں
مگر سچ ہے
کہ ہم دیر سے آئے
کوئی گھوڑا جو زخمی تھا
تمہارے ہاتھ کا مرہم
اُسے وہ کتنا بھایا تھا
تمہارے شانے سے لگ کر
اُسے راحت ہوئی تھی نا!
سُنو جاناں!
محبت تو محبت ہے
وہ گھوڑا ہو کہ ہم تم ہوں
محبت میں حرارت ہے
حرارت زندگانی ہے
حرارت اِک روانی ہے
مگر جاناں
حرارت زندگانی ہو
حرارت میں روانی ہو
یا چاہے اِک کہانی ہو
سُنو ہم دیر سے آئے۔۔۔

فائزہ صابری نوا

''دھواں''

فائزہ صابری نوا

میں دھواں ہوں
لکڑی کا کالا دھواں
آنکھیں جلا دینے والا
قطعی بے رحم دھواں
میں جنگل کی لکڑی
میں بے قصور کالا دھواں

میں نے بہت سر ٹکرایا ہے
میرے سر کی چوٹ
نظروں سے اوجھل ہے
کہاں جانا ہے!
یعنی کہاں کہاں ٹکرانا ہے
اُف!! کہاں جانا ہے
دھواں پریشان ہے
دیکھو میں پریشان۔۔۔۔
جلانے والے نے سلگایا
بڑا سا پرندہ پکایا
آتش دان سلگتا چھوڑ دیا
تو دھواں کہاں جائے!
چمنی سے سر ٹکراتی
اوپر نکل گئی ہوں
جانے کہاں گئی ہوں!
بے اماں۔۔۔۔۔
مجھے تو کوئی ڈھونڈے گا بھی نہیں
میں تو چاہے گم جاؤں
کوئی نہیں جانتا
گوشت کھانے والے
گوشت لے گئے
میں دھواں ہوں
رائیگاں۔۔۔

فائزہ صابری نوا

اور یادیں،
سرور کی گمشدہ فائلوں میں
کسی ناقابلِ بازیافت تاریخ کی طرح دفن

کیا تم نے دیکھا،
خدا کی آخری سانس کسی سرچ انجن کی اپڈیٹ میں
ہمیشہ کے لیے ""deprecated"" ہو گئی؟
کس طرح آسمانی کتابیں
کسی نیورل نیٹ ورک کے کیچ میں قید ہو گئیں؟
اور عبادت گاہیں،
اب فقط access denied کا اشارہ دے رہی ہیں؟

مجھے ہنسی آتی ہے خود اپنے ایمان پر،
جو کبھی دعا تھا، اور اب ایک spam folder
اپنی نجات کی منظوری کا منتظر

یہ شہر، جو روشنی کا امین تھا،
اب سلیکان کی دیواروں میں
اپنی گمشدگی کا نوحہ لکھ رہا ہے
یہ لوگ، جو خدا کی تلاش میں تھے،
اب کسی مصنوعی شعور کی گواہی میں
اپنی شناخت کھو رہے ہیں

اور میں؟ میں فقط ایک صفر ہوں،
جو کسی بے سمت الگورتھم کے سائے میں
اپنی بقا کی سرگوشی کر رہی ہوں
کیا میں زندہ ہوں؟ یا فقط ایک ڈیٹا پوائنٹ،
جسے مستقبل کی تاریخ نے
ہمیشہ کے لیے ""cache"" میں ڈال دیا ہے؟

تم ہنستے ہو، مگر تمہیں معلوم نہیں،
کہ یہ ہنسی بس آخری گمشدگی کا اعلان ہے
تمہارے خدا نے خودکشی کر لی،
اور مشین نے
اس کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا

یہی باقی ہے
یہی بقا ہے
اور یہی ہماری آخری شناخت

سدرہ افضل

بہ یاد: سید قاسم محمود
Book Digest
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور ملتان
براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی کی تخلیقات (شاعری و نثر)
"ان پیج" فارمیٹ میں ای میل کیا کریں
مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کئے جا سکتے ہیں
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل
جاز کیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جا سکتا ہے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
ISSN 2079-4584
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
042-37322996
0333-4377794
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
برائے خط کتابت
ترسیل زر/رابطہ
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

خوابوں کے ملبے پر کھڑے ہم

میں چلتی ہوں خوابوں کے ملبے پر
جہاں دیواریں فقط ایک ڈیٹا سیٹ ہیں،

ادبی تقریبات

عکسی مفتی کی کتاب ''محمد ﷺ جدید دور میں'' کی تقریب پذیرائی

الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد میں معروف دانشور، محقق اور ادیب جناب عکسی مفتی کی فکر انگیز تصنیف ''محمد ﷺ جدید دور میں'' کی ایک پُروقار تقریب پذیرائی منعقد ہوئی۔ اس علمی وفکری نشست میں اردو ادب، اسلامی فکر اور جدید سماجی شعور سے تعلق رکھنے والی کئی نمایاں شخصیات نے شرکت کی۔

اس تقریب کی صدارت معروف نقاد، شاعر اور ماہر تعلیم پروفیسر جلیل عالی نے فرمائی۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں عکسی مفتی کی علمی وسعت، تجزیاتی اسلوب اور عصر حاضر کے تناظر میں سیرتِ نبویؐ کی تفہیم کو سراہا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کتاب نہ صرف سیرت نگاری میں ایک نیا زاویہ فراہم کرتی ہے بلکہ جدید ذہن کو سیرت کے آئینے میں دیکھنے کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔

مہمانانِ خصوصی میں پروفیسر ڈاکٹر خالد مسعود (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد) اور پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر (ڈائریکٹر جنرل، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد) شامل تھے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے کتاب کو جدید فکری سوالات کا مدلل جواب قرار دیا اور کہا کہ عکسی مفتی نے جس جرأتِ فکری اور نکتہ رس بصیرت سے موضوع کو برتا ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ ڈاکٹر سلیم مظہر نے کہا کہ یہ تصنیف علمی مکالمے کی نئی راہیں ہموار کرتی ہے اور جامعات میں فکری سرگرمیوں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

محترمہ فرحین چوہدری نے بطور مہمانِ اعزاز شرکت کی اور اپنی گفتگو میں کتاب کو تہذیبی ہم آہنگی اور فکری بیداری کی جانب ایک مؤثر قدم قرار دیا۔

تقریب کی نظامت ڈاکٹر شیر علی نے نہایت سلیقے اور متانت سے انجام دی۔ انہوں نے مہمانانِ گرامی کا تعارف پیش کیا اور مصنف کے فکری پس منظر اور کتاب کی اہمیت پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔

بزم چغتائی کا ماہانہ مشاعرہ

بزمِ چغتائی کا ماہانہ مشاعرہ بابت ماہ جون، اتوار یکم جون کو عزیزم فرہاد ترابی کے دولت کدہ پر منعقد کیا گیا، یہ مشاعرہ دوستانِ طارق چغتائی کی سالانہ میٹنگ بھی تھی اور محفلِ دوستاں بھی، اس مشاعرہ کی صدارت باکمال شاعر جناب عطا العزیز نے کی جبکہ مہمانانِ خصوصی میں پروفیسر فرخ محمود اور محمد افضل ساجد شامل تھے۔ نظامت کے فرائض خاکسار وسیم عباس کے ذمہ تھے۔ دیگر شعرائے کرام میں وسیم عباس، فرہاد ترابی، راؤ ندیم احسان، عاصم خواجہ، ممتاز راشد لاہوری، محمد علی صابری اور محمد عباس مرزا شامل تھے۔ تمام ہی احباب نے خوب کلام سنایا اور داد سمیٹی۔ دوستانِ طارق چغتائی کی اس سالانہ میٹنگ میں گزشتہ مہینوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ ہونے والے مشاعروں کے لئے لائحہ عمل ترتیب دیا گیا۔ جناب محمد عباس مرزا صاحب نے آنے والے معزز مہمانوں کو اپنا تازہ بیت پراگا پیڑاں بہت محبت سے پیش کیا، میں ان کے اٹھارویں بیتا پراگا کی اشاعت پر مرزا صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ہمارے میزبان فرہاد ترابی نے بطور میزبان ہمارے دل جیت لئے اور شعرائے کرام کی تواضع میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ سب سے پہلے ٹھنڈے ٹھار تربوز سے مہمانوں کو خوش آمدید کہا گیا اور مشاعرہ کے اختتام پر لذیز کھانے اور چائے کا اہتمام بھی فرہاد بھائی نے کیا۔ اس محبت کے لئے ہم سب فرہاد بھائی کے شکر گزار ہیں۔ آپ تمام احباب کی آمد کا شکریہ۔

(بہ شکریہ وسیم عباس)

''رحمتاں سرکار دو عالم ﷺ دیاں'' کی تقریب رونمائی، ہزارہ بھر سے معروف علمی و ادبی شخصیات کی بھرپور شرکت

معروف شاعر و ادیب عبدالوحید بسمل کی سیرت رسول ﷺ پر ہندکو میں لکھی تازہ تصنیف ''رحمتاں سرکار دو عالم ﷺ دیاں'' کی تقریب رونمائی بزم علم وفن پاکستان (ہزارہ شاخ) کے زیر اہتمام ماڈرن ایج پبلک سکول و کالج گرلز کیمپس ایبٹ آباد میں پروفیسر وحید قریشی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مفتی عنایت الرحمان ہزاروی مہمان خصوصی اور مولانا محمد اعظم قادری اور محترمہ شائستہ چوہدری ایڈوکیٹ مہمانان اعزاز تھے۔ مقالا نگاروں میں سہیل صمیم اور قاری امداد اللہ شامل تھے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عامر سہیل نے بخوبی سرانجام دئے۔

تقریب کا آغاز تلاوت قران مجید فرقان حمید سے ہوا جس کی سعادت سکول ہذا کے ایک اہلکار نے حاصل کی۔ معروف نعت خواں محترمہ منزہ وحید نے گل ہائے عقیدت بحضور سرور کائنات ﷺ نچھاور کر کے روح پرور فضا قائم کردی۔

معروف براڈ کاسٹر محمودہ چوہدری، ہزارہ کی علمی و ادبی شخصیات میں سے پروفیسر محمد فرید، پروفیسر ممتاز حیدر اور ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی اور مقالا نگار جناب سہیل صمیم نے کتاب مزکورہ کی اہمیت اور ہندکو ادب میں اس ضرورت اور اس کے مطالعے سے سیرت پاک کے ایک مخصوص حوالے سے آگہی پر، پر مغز مقالا پیش کر کے خوب داد وصول کی۔

تقریب کے میزبان اور بزم علم وفن کے صدر اور

مایہ ناز ماہر تعلیم محترمہ واحد سراج نے جملہ شرکائے محفل کی تشریف آوری پر ان کا شکریہ ادا کیا اور عبدالوحید بسمل کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کی۔

تقریب کے مہمانان اعزاز مولانا محمد اعظم قادری اور محترمہ شائستہ چوہدری نے بھی اس محفل سے کتاب کے حوالے سے عمدہ خطاب کیا۔

مہمان خصوصی مفتی عنایت الرحمان ہزاروی نے کتاب مزکورہ کے مسودے کی خواندگی ، پڑتال اور اس پر اپنے تقدیمی مضمون اور کتاب کے علمی اور ادبی مقام پر عالمانہ خطاب کیا۔۔ صاحب صدارت پروفیسر وحید قریشی نے تفصیلی خطبہ صدارت دیا جس میں اس کتاب کے ہندکو ادب میں سیرت پاک کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں میں خاص مقام اور اہمیت پر خوبصورت بات چیت کی اور انسانی زندگی کے اصلاحی پہلوؤں پر آپ (ص) کی تعلیمات کو ایک الگ کتابی صورت میں پیش کرنے پر عبدالوحید بسمل کو مبارک باد پیش کی۔ اس موقع پر صاحب کتاب عبدالوحید بسمل نے واحد سراج صاحب کا اتنی محبت سے ایک عمدہ تقریب کے انعقاد اور جملہ شرکائے محفل کی بھرپور شرکت پر شکریہ ادا کرتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں اس کتاب کی قبولیت اور لکھاری و قاری کے لئے باعث بخشش و مغفرت ہونے کی دعا کروائی۔ اس خوبصورت تقریب کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ اسمیں لاہور میں رہائش پزیر ہزارہ کے سپوت اور مایہ ناز کالم نگار، ڈرامہ نگار اور سینئیر صحافی اور متعدد کتابوں کے مصنف ملک محمد ریاض، بزم مصنفین کے صدر عظیم ناشاد اعوان، پروفیسر سعید قریشی، ہزارہ اباسین آرٹس کونسل ایبٹ آباد کے سیکرٹری خالد وحید قریشی، شعبہ موسیقی کے سربراہ راحیل عباس بارک زئی، شبیر ثمر، معروف شعرا، میجر امان اللہ خان امان، احمد ریاض، اختر زمان اختر، ضیا شاہد، اختر نعیم، پروفیسر مشتاق احمد صدیقی، فاطمہ رفیق۔ آسیہ قیوم، ہزارہ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر محمد عابد اور پروفیسر محمد عثمان، سید تنویر حسین شاہ، مولانا سراج حسین شاہ، قاری سراج احمد قریشی کے علاوہ ایلاف کلب کے ممبران اور معاشرے کی کئی دوسری اہم علمی و ادبی شخصیات نے اپنی شرکت سے اس محفل کو ایک یادگار بنا دیا۔۔

تقریب کا اختتام محفل کے میزبان واحد سراج کی طرف سے عمدہ ریفریشمنٹ پر ہوا۔

سیوا آرٹ سوسائٹی کا مشاعرہ

مشاعرہ رپورٹ: (دلشاد نسیم آپی)

یہ مشاعرہ امن مشاعرہ تھا جس میں فلسطین اور غزہ پہ ڈھائی جانے والی قیامت کے لیے شاعروں نے بہت اچھے شعر کہے اور اپنے جذبات کا اظہار کیا اور فلسطین کی عوام کو بتایا کہ ہم ان کے ساتھ ہیں۔۔

حسبِ روایت مشاعرے کا آغاز عرفان صادق نے کیا جو کہ سیوا آرٹ سوسائٹی کے چیئر مین پرسن ہیں عرفان صادق تقریبا 25 سال سے اپنے اس گروپ کو بہت کامیابی سے چلا رہے ہیں اور اسی بینر کے تحت کتب کی اشاعت کا کام بھی کر رہے ہیں۔۔

اللہ تعالی کی پاک کلام سے پروگرام شروع ہوا اور پھر سلسلہ چلتا رہا بہت اچھے اشعار سننے کو ملے پرانے شاعر تو تھے ہی کمال نئے شاعروں نے دھمال ہی مچا ڈال دی۔ یہاں ایک شاعر" بچہ" ممکن ہے ابھی اس کا آئی ڈی کارڈ بھی نہ بنا ہو"علی حمزہ" جس کا میں خصوصا ذکر کرنا چاہوں گی اس کے ایک ایک شعر پہ سب نے کھل کر داد دی۔۔ مبارک ہو بیٹا مشاعرہ آپ نے لوٹ لیا۔

محفل کی صدارت معروف ترقی پسند ادیب اور شاعر جناب عابد حسین عابد نے کی جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا مشاعرے کا ٹائٹل بھی انہی کے مصرعے پہ تھا۔ جبکہ مہمانان خصوصی سبطین رضا اور شہزاد نیر تھے۔

مہمانان اعزاز احمد حماد، ڈاکٹر صغیر صفی، احتشام حسن، ساجد لطیف، گل جہاں، اور طاہر ہاشمی تھے

نظامت کے فرائض، عرفان صادق، اسد علی اور آصف جاوید نے ادا کیے۔

جن شعراء کرام نے اپنے اشعار سے نوازا ان کے اسمائے گرامی ڈاکٹر افتخار الحق، وسیم عباس، مقصود خالق، آغر ندیم ساحر۔ غلام مصطفی باسم، نسیم گلفام، نعیم عباس ساجد، عبداللہ ہاشمی ، امتیاز انجم، طلحہ غفور، زاہد عزیر، حسنین احمد، وقار احمد وقار، عامر مجید، صلاح الدین، طاہر زمان طاہر، اور علی حمزہ، مشاعرے کو شائقین کی ایک بڑی تعداد نے سنا اور خوبصورت اشعار سے لطف اندوز ہوئے مشاعرے کی انتظامیہ دلشاد نسیم (فنانس سیکریٹری) علی صدف (وائس چیئرمین)

ثمینہ سید (پریزیڈنٹ) اسد علی (وائس پریزیڈنٹ) آصف جاوید (جنرل سیکریٹری) ہنزلہ شاہد (جوائنٹ سیکریٹری) عزیز مغل (میڈیا کورڈینیٹر) طاہر ہاشمی (افارمیشن سیکریٹری) یقینا مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یوں یہ کامیاب مشاعرہ تقریبا آٹھ بجے کے قریب چائے اور بسکٹ پہ ختم ہوا۔۔ تصاویر بنائی گئی گپ شپ ہوئی اور پھر ہم سب خوبصورت سے چمکتے دمکتے الحمرا کو الوداع کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔۔

دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

نستعلیق پبلی کیشنز، جہاں الفاظ کو آبرو ملتی ہے

ادب کی خوشبو، لفظوں کی لطافت، اور خیالوں کی نزاکت کو دلنشین قالب میں ڈھالنے والا ایک معتبر نام

نستعلیق پبلی کیشنز

ہم محض کتابیں شائع نہیں کرتے،
ہم خوابوں کو قرطاس پر لفظوں کی صورت سنوارتے ہیں۔
ہمارے ہاں ہر تصنیف ایک فن پارہ ہوتی ہے۔

نستعلیق اُن اہلِ قلم کا انتخاب ہے جو اپنے لفظوں کو وہی وقار دینا چاہتے ہیں، جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

ہمارے ہاں معیارِ طباعت، حسنِ سرورق، ادبی شائستگی اور فروغِ ادب کی سچی لگن۔
یہ سب اقدار ایک ہی مقام پر یکجا نظر آتی ہیں۔

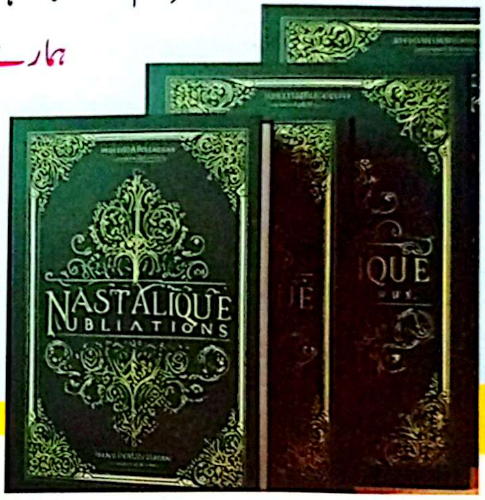

جہاں آپ کی تخلیق کو وہی عزت، محبت اور تہذیب عطا کی جاتی ہے، جو ایک سچے فن پارے کا حق ہے۔

اب یہی ہے
آپ کی تخلیقی شناخت

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

جاپان اور پاکستان سے بیک وقت شائع ہونے والا

ماہنامہ ارژنگ، حرف وخیال کی ایک مہک دار دنیا

ادب وہ آئینہ ہے جس میں قوموں کی تہذیب، روح کی گہرائیاں اور فکر کی بلندی عکس بنتی ہے۔ اور ماہنامہ ارژنگ اس آئینے کو پچیس برسوں سے تھامے، جمالِ ادب کو محبت سے سنوارتا چلا آ رہا ہے۔ لاہور کی ادبی فضاؤں سے جنم لینے والا یہ ماہنامہ محض ایک رسالہ نہیں، بلکہ ایک علمی و ادبی تجربہ ہے جو قاری کو لفظوں کے معطر گلشن میں لے جاتا ہے۔ ارژنگ کی ہر اشاعت ایک فکری جشن ہے، جس میں

- نورِ نعت اور حمد کی پاکیزہ مہک
- تحقیق وتنقید کی گہرائی
- شاعری کی رنگینی وشگفتگی
- افسانوں کا جادو
- سفرناموں کی وسعت
- خاکوں کی نفاست
- ادبی تقریبات کی جھلکیاں
- کتابوں پر سنجیدہ تبصرے
- اور قارئین کے دل سے نکلے ہوئے خطوط

سب کچھ ایک ہی دامن میں سمٹ آتا ہے۔ یہاں سخن کے وہ دو چراغ بھی روشن کیے جاتے ہیں جو ہر شمارے میں کسی معتبر ادیب یا شاعر کی زندگی اور فکر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ انٹرویوز، جو قاری کو براہِ راست ان ادبی قد آور شخصیات سے جوڑتے ہیں۔

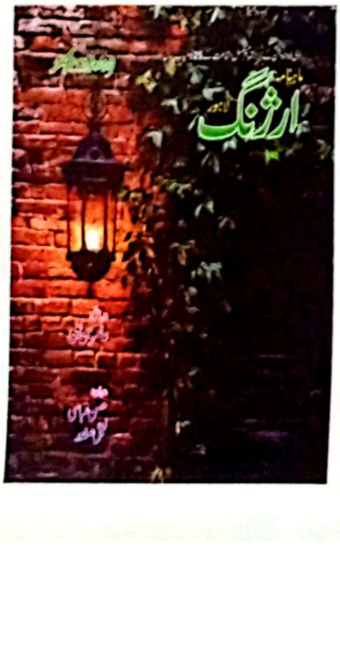

عامر بن علی جیسے بصیرت افروز مدیر اعلیٰ کی رہنمائی میں، حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی ادبی نگاہ سے ترتیب پانے والا یہ رسالہ اردو ادب کے سنہرے قافلے میں ایک روشن مشعل کی مانند ہے۔ اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں، اگر آپ لفظوں کے لمس سے روح کو سرشار کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی نسل کو فکر وفن کی روایت سے آشنا کرنا چاہتے ہیں، تو ماہنامہ ارژنگ کی رفاقت سے بہتر کوئی انتخاب نہیں۔ سالانہ ممبرشپ صرف 1500 روپے۔ یہ کوئی قیمت نہیں، یہ تو لفظوں کی اس بزم میں شامل ہونے کا پاس ہے جہاں ادب جیتا ہے، سانس لیتا ہے، اور آپ سے ہمکلام ہوتا ہے۔
آیئے، ارژنگ کے قافلے کا حصہ بنیے۔ کیونکہ ادب صرف پڑھنے کا نام نہیں، جینے کا نام بھی ہے!

دفتر ماہنامہ ارژنگ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور 0300-4489310

CamScanner

معروف شاعر عامر بن علی کے ساتھ ایک شام اور عید ملن مشاعرہ

مجلس فروغ ادب اور پریس کلب کبیر والا کے زیر اہتمام یادگار محفل

اہتمام: سید فرخ رضا ترمذی — نظامت: محسن رضا شافی — مہمان اعزاز: آغا سہیل عابدی

تقریب کی صدارت قمر رضا شہزاد نے فرمائی

مہمان خصوصی طاہر نسیم اور افضل گوہر راؤ تھے

قمر رضا شہزاد

عامر بن علی

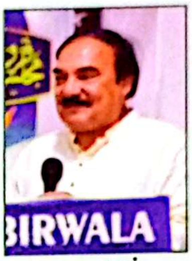

افضل گوہر راؤ

سہیل عابدی

تاثیر جعفری

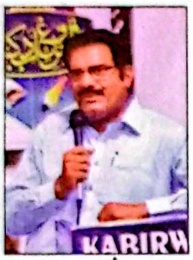

رانا نعیم طارق

محسن رضا شافی

طارق جاوید

عمر طارق

سید فرخ رضا ترمذی

طاہر نسیم

فیصل مسعود پنیاں

مزمل ادراک

حسین اکبر

تقریب میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے افراد نے کثیر تعداد میں بھرپور شرکت فرمائی

پھولوں اور کتابوں کا تبادلہ کیا گیا۔ تقریب کے اختتام پر کتب پر دستخط کیے گئے

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور

0300-4489310 - 0331-4489310

nastalique786@gmail.com

CamScanner